جلد ۳ - جولائی سنہ ۱۹۰۲ء - نمبر ۴

ایڈیٹر

شیخ عبدالقادر بی - اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامینِ نثر

اسرارِ وجود - ایڈیٹر - ۱
گوتم بدھ - م - ل (ایم - اے) - ۵
تبادلۂ خیالات - از مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر - ۱۲
متروک الفاظ - مولوی فضل الحسن حسرت موہانی - ۲۰
روئے زمین کا سفر - سید شریف حسین بی - اے ہیڈ ماسٹر مڈل سکول الہ آباد - ۲۳
گناہ - ح - م شیرانی - ڈگی منشی فاضل - ۳۰
حکام کی تقلید - مشتاق احمد زاہدی دہلوی - ۳۶

مضامینِ نظم

سالگرۂ حضور - پروفیسر عبدالغفور صاحب شہباز اورنگ آبادی - ۴۱
مذہب اور سائنس - منشی سراج الدین احمد
گورنمنٹ پنشنر - ۴۴
بادل - میر نیرنگ بی - اے - ۴۸
انتظارِ بہار - منشی صادق علی خاں انسری نگر - ۵۰
ماتمِ پسر - شیخ محمد اقبال ایم - اے - ۵۳
پھول - ۵۵

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

☐ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے - ⊕ ان شہروں میں اردو مروج ہے - ○ ان شہروں میں اردو سمجھتے ہیں -

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبدالعزیز کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ عبدالقادر بی - اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ملک کے مستند اور مشہور مضمون نگاروں کے علاوہ ایک معقول تعداد نئے اور ہونہار اہلِ قلم کی اس کی اعانت میں مصروف ہے۔ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں پائے ہوئے اصحاب جنکو آج تک ملکی علم ادب سے غافل سمجھا جاتا تھا۔ شوق سے اس کے بنانے میں شریک ہو رہے ہیں۔ اور کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا جس میں کم از کم دو چار مضمون ڈگری یافتہ اصحاب کی طرف سے نہ ہوں۔ مضامین عام دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ اور کوشش کیجاتی ہے کہ ہر قسم کے مذاق کے لئے کچھ نہ کچھ ہر پرچہ میں موجود ہو۔ رسالہ کا حجم (۱۸×۲۲) کی تقطیع پر (مع سرورق) ساٹھ صفحہ کا ہے۔ قیمت عمدہ دبیز ولایتی کاغذ پر بلا محصول تین روپیہ۔ اور دوم درجہ کے کاغذ پر دو روپیہ ہے۔ اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ان قیمتوں پر نہیں دیا جاتا۔ محصول ڈاک دونوں صورتوں میں ۶ آنہ سالانہ ہے۔

درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنی چاہئے۔ مابعد کا کوئی حساب نہیں۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے چار آنے کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ شیخ عبد القادر مالک و ایڈیٹر

شرح اجرتِ اشتہارات

مخزن۔ اشتہارات کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ اس کے خریداروں کی لمبی فہرست میں پنجاب کے لوگ بھی ہیں اور صوبجات متحدہ و اودھ کے بھی۔ اضلاع دکن اور حیدر آباد میں بھی بکثرت بکتا ہے۔ اور وہاں کے امرا اور روسا کی ایک کثیر تعداد اس کے قدردانوں میں ہے۔ شمالی ہندوستان کے بھی معزز ترین مسلمانوں کے اسمائے گرامی اسکی فہرست میں شامل ہیں اس لئے اس کے ذریعہ اشتہار دینے والے حضرات جلد اس کی قابلیتِ اشتہار کا اندازہ کر سکینگے۔ ایک سہ ماہی کے لئے آزما کر اگر فائدہ نظر آئے تو سال بھر کا معاہدہ کریں۔ اجرتِ اشتہارات فی صفحہ سال بھر کے معاہدہ کے لئے ۳۰ ششماہی کے لئے عہ اور سہ ماہی کے لئے لعہ روپیہ۔ فی نصف صفحہ سال بھر کے واسطے عــہ روپیہ ششماہی کے لئے لعہ اور سہ ماہی کے لئے صہ۔ اتفاقی اشتہارات کے لئے ۸ر فی سطر۔ اس شرح میں کمی کی گنجائش نہیں۔ شیخ عبد القادر مالک و ایڈیٹر

مخزن

اسرارِ وجود

نشوی واقفِ یک نقطہ زاسرارِ وجود
گر تو سرگشتہ نشوی دائرہ دوراں را (حافظ)

حافظ کا کلام جس پایہ قبول کو پہنچ چکا ہے۔ محتاجِ بیان نہیں۔ اور اس قبولیت کی بڑی وجہ یہی ہے۔ کہ اس دریائے عرفان کے شناور کی زبان سے بیساختہ رموزِ معرفت کے ایسے ایسے نکتے نکل گئے ہیں۔ جو اور شعرا میں کم پائے جاتے ہیں۔ بلکہ اس خاص صیغہ میں بیشتر شعرائے فارس و ہندوستان حافظ کے خوانِ علم کے ریزہ رُبا ہیں۔ انہیں نکات میں وہ نکتہ ہے۔ جو شعرِ مندرجہ بالا میں نہایت پرزور الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ گو اس کے سچے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر اس کے متعلق یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ اس شعر کا اور اس قسم کے اور اقوال کا اثر مختلف آدمیوں پر مختلف پڑتا ہے۔ جہاں یہ منتہیوں کے لئے چراغِ ہدایت ہیں۔ وہیں یہ مبتدیوں کے لئے باعثِ گمراہی بھی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ حافظ اور اس رنگ کے اور مصنفین اور شعرا کی تصانیف کی بابت ہمیشہ سے دو رائیں چلی آئی ہیں۔ ایک فریق انکو نہایت اعلیٰ سمجھتا ہے اور انکی تعریف کرتے نہیں تھکتا۔ اور دوسرا فریق اُن کی مذمت کرتا اور ان کے مطالعہ سے لوگوں کو روکتا ہے۔ اور اپنی اپنی جگہ دونوں حق بجانب ہیں۔ اُن

لوگوں کے لئے جو ان حقائق کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو ایسی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ اِن کے مطالعہ سے بہتر شغل نہیں ہو سکتا۔ اور اُن کے لئے جو اُس فہم سے بہرہ ور ہی نہیں ہوئے۔ جو اِن کے مطالب کے اِدراک میں مدد دے۔ اِن کا مطالعہ نہایت مضر ہی اب اِسی مسئلہ اسرارِ وجود کو دیکھئے۔ اِس سے زیادہ سچی بات کیا کہی جا سکتی ہی۔ کہ اسرارِ وجود اسقدر پیچیدہ ہیں۔ ان کی تحقیقات کی راہیں ایسی باریک اور دشوار گذار ہیں۔ اور اُنکی علم کا احاطہ ایسا وسیع اور ان کی اصلیت کا سمندر ایسا ناپیدا کنار ہی۔ کہ آپ عمر بھر ٹوہ لگاتے رہیں۔ اس کی تھاہ کو پہنچنا محال ہی۔ لیکن اسی بات کا دُوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی یہ شکر تلاش اور تجسس کو ہی چھوڑ بیٹھے۔ اور ہمت ہار دے۔ تو اُس سے زیادہ غلطی اور خسارہ میں پڑنے والا کون ہو سکتا ہی۔ دُنیا میں جتنے فلسفی گذرے ہیں۔ جن کا نام اُن کے علم و فضل اور خردوری کے سبب سے آج تک ادب سے لیا جاتا ہے۔ سب مدت العمر اسرارِ وجود کی دریافت میں مصروف رہے۔ اور شاہدِ مقصود ہاتھ لگا یا نہ لگا۔ مگر اُن کی یہی تلاش اُن کے بقائے نام کا سبب بن گئی۔ جتنے نامور اہلِ دین و دنیا نِ مذاہب گذرے ہیں۔ اُن کی زندگی کا سب سے اعلےٰ مقصد اسرارِ وجود پر روشنی ڈالنا تھا۔ اور جہانتک اُن کے وسائل نے اجازت دی انہوں نے خود تلاش سے کام لیا۔ اور جو کچھ انہیں اس تلاش میں ملا۔ اُسے اُنہوں نے کھلے دل سے اپنے ابنائے جنس کے سامنے رکھدیا۔ آگے یہ دُوسروں کے نصیبوں پر رہا۔ کہ وُہ کس حد تک اِس تحقیقات سے مستفید ہوئے۔ ہر ایک نے اپنی محدود انسانی عقل اور اپنی مسدود حدِ نگاہ کے مطابق کچھ نہ کچھ اخذ کر لیا۔ اگر یہ لوگ سب اس نصیحت کے بدیہی معنوں پر عمل کرتے جو حافظ کے مندرجہ عنوان شعر سے حاصل ہوتی ہی۔ تو یقیناً یہ مسئلہ سخت تاریکی میں رہتا اور اسرارِ وجود سے تھوڑی بہت آگاہی رکھنے والے بھی دُنیا سے مفقود ہوتے۔ جو لوگ اس رمز سے آگاہ ہیں جو حافظ شیرازی نے اِس شعر میں بیان کی ہی۔ وُہ یہ تسلیم کرینگے۔ کہ یہ

اِنتہائے مقصد رسی کا اظہار ہے۔ علم ابتدائی حالت میں انسان کو اپنی معلومات کی وسعت پر نازاں کرتا ہے۔ اس درجہ میں آدمی دوسرے ابنائے جنس کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے یا اُن کی کم علمی پر رحم کرتا ہے۔ اپنی بڑائی پر فخر کرتا ہے۔ اور سمجھتا ہے۔ کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ اس کے بعد ایک درجہ آتا ہے۔ کہ صاحبِ علم وسعتِ علم کو دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے اور اُس کی خاموشی اُسے تصویرِ حیرت بنا دیتی ہے۔ ؎

جو طبلِ تہی ہیں وُہ بنکارتے ہیں جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

اس مرحلہ سے گذر کر ایک منزل آتی ہے۔ جہاں خاموشی پھر مبدّل بہ گویائی ہوتی ہے۔ مگر اِس گویائی میں نخوت وغرور وتکبر کا کہیں پتا نہیں ہوتا۔ ہر بُن مُو سے صدائے "من نیم و من نیستم" نکلتی ہے۔ اور علامۂ دہر پکار اُٹھتا ہے۔ "ایں قدر دانستم کہ ہیچ نہ دانستم"۔ یہ تھا قول ایک مشہور ترین حکیم کا۔ اپنے بسترِ مرگ پر۔ موجودہ زمانہ کا ایک بڑا بلند پایہ جرمنی مصنف جس کے تبحرِ علمی کا سارا فرنگستان معترف ہے۔ مرتے وقت آبِ حیاتِ علم کے لئے العطش العطش پکارتا ہوا گیا۔ اور اُسکے آخری الفاظ یہ تھے۔ "اور روشنی! اور روشنی!" اِسی بے چینی کا اظہار حافظ نے کیا ہے۔ جب اُس نے یہ کہا ہے۔ کہ اسرارِ وجود کی تحقیق کے میدان میں خواہ آپ کتنے گھوڑے دوڑائیں۔ اس کے کوہ و دشت میں کتنا ہی سر ٹکرائیں۔ اور آخر کسی حد تک اپنی معلومات کو لے جائیں۔ مگر یہ سمندر اتنا وسیع ہے۔ کہ اِس کے ایک قطرہ سے بھی آپ آشنا نہ ہونگے۔ یہ دائرہ اتنا بڑا ہے۔ کہ اس کے ایک نقطہ پر بھی آپ حاوی نہ ہونگے۔ اس کا مطلب جو کچھ ہم سمجھتے ہیں انتہائے علم انسانی کے محدود ہونے کا اعتراف ہے۔ ورنہ اس سے یہ غرض ہرگز نہیں۔ کہ ہر نوجوان زندگی کا آغاز کرنے والا۔ ہر طالبِ علم طلبِ علم میں عازمِ سفر ہونے والا۔ ہر متلاشی اور ہر متجسس تلاش و جستجو سے دست بردار ہو جائے۔ کیونکہ ایک صاحبِ عرفان نے کہہ دیا ہے کہ اِس جستجو سے حاصل کچھ نہیں۔ طالب کو چاہیے کہ سرگرمِ جستجو رہے۔ بلکہ جستجو کا ہی کوچہ وہ

کوچہ ہے۔ جسکی خاک چھاننی انسان کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہی۔ اور جس کی خاک چھانتے چھانتے انسان حقائق و معارف کے اتنے ریزہ ہائے زر و جواہر جمع کر سکتا ہے۔ کہ سمیٹے نہ سمیٹے جائیں اور اُس کا دامن گوہرِ مقصود سے مالا مال ہو کر ایسی دولتِ بے انتہا نظر آئے کہ وُہ مجبور کہ اُٹھے۔ ؎

دامانِ نگہ تنگ و گُلِ حسنِ تو بسیار گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

لاثانی اُستانی - چوہدری خوشی محمد صاحب بی۔ اے۔ المتخلص بہ ناظر کے نام نامی سے پنجاب اور صُوبجاتِ متحدہ کے اکثر اصحاب واقف ہیں۔ علیگڈھ کالج میں وُہ مذاقِ علمی میں ممتاز رہے ہیں۔ کئی مجالس اور کانفرنسیں انکی نظموں اور تقریروں سے رونق پاتی رہی ہیں اور آجکل وُہ ریاست جموں و کشمیر میں صاحب کشنر بندوبست مددگار خاص (پرسنل اسسٹنٹ) ہیں۔ اُنہوں نے ایک بیش بہا کتاب لکھی ہی۔ جس کا نام "لاثانی اُستانی" ہے۔ اور مقصد اس کا یہ ہی۔ کہ تعلیم نسوان کے لئے خاص طور پر مفید ہو۔ ہمارے ملک میں یہ شکایت عام ہی۔ کہ مستورات کے مطالعہ کے لئے کتابیں موجود نہیں۔ یہ کتاب اِسی ضرورت کو پُورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس ضرورت کو خوب پُورا کرتی ہے۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ طبعیات۔ حفظِ صحت اور دیگر امور اطلاع عامہ کے متعلق دلچسپ معلومات اس میں بطور سوال و جواب کے جمع کی گئی ہیں۔ ایک لڑکی اپنی اُستانی سے مختلف سوال کرتی ہے۔ اور اُستانی سیدھے سادے صاف اور بامحاورہ الفاظ میں جواب دیتی جاتی ہی۔ ہم چوہدری صاحب کو اُن کی مساعی کے کامیاب ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ ملک کی لڑکیاں اس "لاثانی اُستانی" کی قدر کرینگی۔ کیونکہ ایسی مشفق اُستانیاں اور ایسی باخبر اُستانیاں ابھی یہاں بدقسمتی سے کمیاب ہیں۔ یہ کتاب عمدگی سے ہلالی سٹیم پریس۔ ساڈھورہ۔ ضلع انبالہ میں چھپی ہے اور غالباً وہیں سے مل سکتی ہی۔

گوتم بُدہ

بُدہ دنیا میں ایک بڑے مہاتما ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے زمانہ کے موجودہ مذہب میں اصلاح کی اور بودھ مت دنیا میں چلایا اور گمراہ شدہ لوگوں کو نیک راستہ پر لائے اُنکی پیدائش اور مذہبی عقیدوں کا مختصر سا حال قلمبند کیا جاتا ہے۔

خاندان اکشواکو یا گوتم نسل سی کپل وستو دیش میں ایک شاکی راجا بنام شُدھودن تھا اور اس کی رانی کا نام مایا دیوی تھا۔ اِن کے ہاں ایک لڑکا بنام سِدھارتھ پیدا ہوا جو بعد میں بُدہ یا گوتم رشی کے نام سے تمام رُوئے زمین پر مشہور ہوا۔ بُدہ کی شادی کولی راجا کی لڑکی یشودھرا سے ہوئی۔ ان دونوں کے ہاں ایک لڑکا راہولا پیدا ہوا ایک دن جب بُدہ اپنے رتھبان مسمّی چنّا کے ساتھ شہر کی گلیوں میں سیر کرتا پھرتا تھا اُسے مختلف اوقات میں تین مختلف حالتیں نظر آئیں۔ ایک دفعہ سڑک کے کنارے ایک بوڑھا آدمی ملا جسکا بدن ضعیفی سے خم کھا گیا تھا۔ چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں اور پیشانی پر فکر و غم کے آثار نمایاں تھے۔ سر سفید۔ آنکھیں چُندھیائی ہوئیں۔ اور جسم مرجھایا ہوا۔ لکڑی کے سہارے بھی بصد مشکل کھڑا ہو سکتا تھا۔ دوسری بار راستہ میں ایک مریض ملا جو بیماری کے مارے سسک رہا تھا۔ جس کے بدن کی حالت بگڑ گئی تھی اور درد و تکلیف کے باعث آہ و زاری کر رہا تھا۔ تیسری بار ایک مردہ لاش ملی جسکو چار آدمی کندھوں پر اُٹھائے مرگھٹ کی طرف لے جا رہے تھے اور باقی آدمی پیچھے پیچھے روتے ہوئے جا رہے تھے۔ ہر حالت میں جب شہزادہ نے رتھبان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دنیا میں صرف خاص خاص شخصوں کی یہ حالت نہیں ہے بلکہ یہ تمام حالتیں دنیا کے سب لوگوں کو پیش آتی ہیں۔ یہ کوئی نرالی بات نہیں۔ سب کو ایک دن فنا ہو جانا

ہے اور اس دار ناپائدار سے رحلت کرجانا ہے۔ کوئی شخص بھی موت کے پنجہ سے نہ بچا اور نہ بچیگا۔ یہ سُنکر شہزادہ بُدھ نہایت ہی ملول خاطر ہوا۔ اور معلوم کیا کہ بس یہ دُنیا ایک سراب ہے۔ کیا مایا کا جال بچھا ہوا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اس جسم کو ایک دن ضرور خاک میں ملجانا ہے۔ مگر پھر بھی لوگ بے پروائی سے اِسی دُنیائے دُوں میں زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں اور عاقبت کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔ ان سب باتوں سے بدھ مہاراج کی طبیعت نے یکایک پلٹا کھایا اور فوراً اُنھوں نے دُنیا کے عیش و عشرت۔ ہر طرح کی لذت۔ تمام راج پاٹ کے سُکھ اور بیوی بچّوں کے آنند کو تیاگ کرکے جنگل کا راستہ لیا اور تارک الدنیا ہو کر پرم آتما حقیقی کی تلاش میں پھرتے رہے سچ تو یہ ہے کہ یہ حالتیں ہر ایک شخص کو اس دُنیا میں اکثر بلکہ ہر لمحہ اور ہر ساعت پیش آتی رہتی ہیں اور موت کی حالت کو دیکھ کر فوراً طبیعت مکدر ہو جاتی ہے آخرت کا خیال آجاتا ہے اور دِل اُسوقت اس دنیا کے چھوڑنے پر مستعد ہو جاتا ہی اور خداوند حقیقی کی طرف رجُوع کرنے لگتا ہی۔ مگر افسوس یہ خیال مثل ایک حباب یا پانی کے بلبلے کے ہے جو اُٹھتے ہی بیٹھ جاتا ہے۔ مثل اُس خلا کے ہے جو پرندوں کے اُڑنے سے ہوا میں پیدا ہو جاتا ہی۔ اور جہاں پرندے ہٹے اُسیوقت پُر ہو جاتا ہی۔ سمندر کے پانی میں مثل اس شگاف کے ہی جو کسی جہاز کے چلنے سے پیدا ہو جاتا ہی۔ اور جہاں جہاز آگے بڑھا اُسیوقت وُہ شگاف مِل جاتا ہی۔ یہی حال اِنسان کا ہی کہ وُہ دُنیا کے دھندوں میں اسقدر مستغرق ہی کہ خالقِ حقیقی اور عاقبت کا خیال اوّل تو پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو چند ہی لمحہ رہتا ہی۔ بہت ہی کم شخص بُدھ جیسے خوش نصیب ہیں جو فوراً اِس دُنیا کی راحت و کلفت کو چھوڑ کر سچّا راستہ ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ اور پھر کبھی اپنا رُخ اِس دُنیا کی طرف کرنے کی آرزو نہیں رکھتے۔

خوشا وقتِ شوریدگانِ غمش اگر ریش بینند و گر مرہمش

مثل مشہور ہی جو بندہ یا بندہ - کچھ عرصہ کے بعد بُدھ جی مہاراج کو گیان ہو گیا اور اُنہوں نے چار گیان یا معرفت کے مسئلے قائم کئے -

(۱) پہلا عُمدہ گیان یہ ہے کہ دُنیا مصیبت اور غم کا گھر ہے - چنانچہ پیدائش - پرورش - بیماری اور موت - اِن میں سے ہر ایک شئے دُکھ سے بھری ہُوئی ہی - پس جس چیز کو ہم پسند نہیں کرتے اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے بھی رنج ہوتا ہے اور پھر جس چیز کو ہم محبت کرتے ہیں اس سے جُدا ہوتے ہُوئے اَور بھی زیادہ ہوتا ہی اور جو چیز کہ میسّر نہیں آسکتی - اُس کی خواہش رکھنے سے بہت ہی رنج حاصل ہوتا ہی -

(۲) دُوسرا عمدہ گیان یہ ہی کہ اس تمام دُکھ یا رنج والم کا باعث خواہش یا لذّت نفسانی ہے - اور گرد کی دُنیاوی چیزیں ہماری طبیعتوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور ایسی زبردست خواہش پیدا کرتی ہیں جسکو فوراً پُورا کئے بغیر انسان رہ نہیں سکتا - مایا رُوپی خودی یا اہنکار پیدا ہو کر دُنیا کی چیزوں میں ملکر اپنے آپ کو پرکاش کرتا ہی - پھر یہ اہنکار خوشی بھوگنے کے لئے زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہی اور دُکھ کے جال میں پھنس جاتا ہے - دُنیاوی لذتیں اور خوشیاں ایک قسم کا طعمہ ہیں اور انجام اُس کا دُکھ ہے -

(۳) تیسرا عمدہ گیان یہ ہے کہ دکھ دُور ہو جائے - جس نے خودی کو جیت لیا وہ خواہش نفسانی سے بری ہو گیا گویا اُس نے نفس آمارہ کو مار لیا - اب اُسے کسی قسم کی حاجت نہیں رہی اور کوئی چیز نہیں رہی جس سے کہ یہ خواہش کا مشغلہ بڑھے - پس اُسے اہنکار یا خودی کا خیال نیست و نابُود ہو جائیگا -

(۴) چوتھا عُمدہ گیان وُہ طریق ہی جسکے ذریعہ یہ دُکھ درد بالکل معدوم ہو جائے - جو شخص معرفت کے سامنے اپنی خودی کو چھوڑ دیتا ہے جو مستقل ہو کر صرف ایسے کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جو اُسے کرنے چاہئیں اور جسے اپنا فرض ادا کرنے کی دلی اور اعلیٰ آرزو

ہوتی ہے وہی شخص نجات حاصل کرتا ہے۔ جو عقلمند شخص اس طریق پر چلیگا۔ اُسکا دُکھ جاتا رہیگا۔

یہ طریق یا راستہ ہے جو راستی پر مبنی ہے۔ (ا) فہم راست (ب) صحیح ارادے (ج) راست گفتگو (د) کارہائے راست (ر) جائز وسائل سے معاش حاصل کرنا (س) صحیح اور سچی کوششیں (ص) صحیح خیالات اور (ط) شانتی سُوبھاؤ۔

عام طور پر ہم بُدھ کی تلقین کا لب لباب اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔ دیانتداری کو ہرگز ہاتھ سے نہ دینا۔ نیک رویّہ اختیار کرنا۔ مصیبتیں اور تکلیفیں صبر سے جھیلنا۔ ہر ایک نیک کام مستعدی سے کرنا۔ نیکوں کے ساتھ ملنا جُلنا اور بدوں کی صُحبت سے گریز کرنا۔ نیکی کرنا۔ بدی سے احتراز کرنا۔ طبیعت کو قابو میں رکھنا۔ نیک کام کرنے میں ہمت نہ ہارنا اور نیک اصُولوں پر قائم رہنا۔

بُدھ جی مہاراج کے بہت سے پیرو ہو گئے۔ اور بہت سے بڑے بڑے شخص اور بعض راجہ بھی اُنکے معتقد ہو گئے۔ اُنکا اصل منشا یہ تھا کہ دُنیا میں رہکر ایسا نہ ہو کہ انسان بالکل دُنیاوی لذّتوں اور خواہشوں میں مُبتلا رہے اور اپنے خالق حقیقی کو بالکل فراموش کر دے۔ بلکہ جہانتک ہو سکے دنیا کی خواہشوں سے بتدریج کنارہ کش ہو جائے اور نیکی خُدا پرستی خدا ترسی محبت اور ہمدردی کا طریق اختیار کرے۔

اُن کے دس احکام مندرجہ ذیل تھے یعنے دس قسم کی بُرائیوں یا بدیوں سے بچنا لازم ہے۔ تین بدیاں متعلق جسم۔ قتل۔ چوری۔ زنا۔ چار بدیاں متعلق زبان۔ جھوٹ بولنا۔ بُرا بھلا کہنا۔ یا اتہام لگانا۔ گالی دینا۔ بیہودہ بکنا۔ تین بدیاں متعلق ذہن۔ طمع۔ نفرت۔ گمراہی۔

(ا) کسی کو جان سے نہ مارو۔ جان کی حفاظت کا خیال رکھو۔ یعنے اہنسا اور جیو رکشا پرم دھرم سمجھو۔

(۲) چوری نہ کرو اور نہ کسی کا مال زبردستی چھینو۔ بلکہ اس امر کے ساعی رہو کہ ہر ایک

شخص اپنی اپنی محنت کا ثمرہ خود کھائے۔

(۳) ناپاکی سے اجتناب کرو اور عفّت عصمت اور پاکدامنی کی زندگی بسر کرو۔

(۴) جھوٹ نہ بولو بلکہ راستباز رہو۔ بے باکی سے اور صدقِ دل سے جو حق ہو وہ بے کم و کاست بیان کر دو۔ بقولِ سعدی ؎

راستی مُوجبِ رضائے خداست کس ندیدم کہ گُم شد از رہِ راست

(۵) کسی کی نسبت بُری افواہیں اپنی طبیعت سے اختراع نہ کرو اور نہ تم ایسی باتوں کو اپنی زبان پر لاؤ۔ اپنے ہمجنسوں کی عیب گیری نہ کرو بلکہ اُن کے ہنر اور صواب کے متلاشی رہو تاکہ تم صدقِ دل سے اُنکے دشمنوں اور حرف گیروں کے برخلاف موقع پر اُنکی مدد کر سکو۔ سعدی شیرازی نے کیا خوب کہا ہو ؎

مرا شیخ دانائے روشن شہاب دو اندرز فرمود بر رُوئے آب

یکے آنکہ در خویش خودبیں مباش دِگر آنکہ بر غیر بدبیں مباش

(۶) قسم نہ کھاؤ بلکہ اپنی عزّت اور رُتبہ کا خیال رکھ کر معقول طور پر گفتگو کرو۔

(۷) بیہودہ بکواس میں وقت ضائع نہ کرو۔ بلکہ جو کام کی بات ہے وہ کہو ورنہ خاموش رہو۔

(۸) طمع نہ کرو۔ حسد نہ کرو بلکہ اَور لوگوں کی خوش قسمتی پر خوشی مناؤ۔ بقولِ شاعر ؎

طمع را سہ حرف است وہر سہ تہی ازاں نیست مر طامعاں را بہی

(۹) دشمنوں سے بھی دل میں کینہ بُغض اور نفرت نہ رکھو۔ ہر ایک کے ساتھ خواہ دشمن ہو خواہ دوست مہربانی اور تلطف سے پیش آؤ۔

(۱۰) جہالت کو دل سے دُور کرو اور نیکی اور معرفت کا راستہ سیکھنے اور اُس پر عمل کرنے میں مستعد رہو۔ نیکی اور راستی صدق دل سے قبول کرو۔ اور ٹھیک راستہ چھوڑ کر گمراہ نہ ہو جاؤ۔

بدھ جی مہاراج کے بہت سے چیلے جابجا ہو گئے اور یہ بھکشو کہلاتے تھے۔ اور یہ

جا بجا دھرم کا اُپدیش کرتے رہتے تھے۔ اب بھی یہ مذہب دُنیا میں بہت مروج ہے۔ اور اس میں دھرم اور اخلاق اور نیکی کی باتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ بھکشو لوگوں کے لئے نہایت عمدہ عمدہ قواعد بنائے گئے چنانچہ چند ہدایات دربارہ سلوکِ زنان و پابندی عفت جو ہر ایک بھکشو کو عمل کرنا لازم ہے درج کیجاتی ہیں:-

اگر کوئی بوڑھی عورت ہو تو اُسے اپنی والدہ کے برابر تصوّر کرو۔ اگر جوان ہو تو اُسے اپنی بہن کے برابر جانو اور اگر بہت چھوٹی ہو تو اُسے اپنی دختر کے برابر سمجھو۔

اِنسانوں میں شہوت نفسانی زیادہ ہوتی ہے اور یہ اندیشہ ناک امر ہے پس پُرجوش اور سرگرم استقلال کی کمان اور دانائی کے تیروں کے تیز نشانوں سے اس پر غالب آؤ۔ اپنے سر پر راستی اور نیکی کی زرہ پہنو اور نہایت مستعدی سے پانچوں قسم کی خواہشوں کو قابو میں رکھو یعنے پانچوں اندریوں کو بس میں رکھو۔

شہوت سے انسان کا پاک دل بگڑ جاتا ہے اور طبیعت پراگندہ ہو جاتی ہے۔ یہ انسان کو جہنم پہنچانے والی شے ہے۔ اس بلا کو ہرگز پاس نہ آنے دو۔

بجائے اِس کے کہ بُرے خیالات تمہارے دلوں میں پیدا ہوں یا کسی عورت کو بُری نظر سے دیکھو۔ بہتر ہوگا کہ تپتی ہوئی نہایت سُرخ لوہے کی سلاخوں سے اپنی دونو آنکھیں پھوڑ ڈالو۔

بجائے اِس کے کہ کسی عورت کے ساتھ رہو اور فاسد خیالات کو اپنی طبیعت میں راہ دو۔ بہتر ہوگا کہ تُند شیر کے منہ میں پڑ جاؤ یا جلّاد کے تیز خنجر سے ذبح کئے جاؤ۔

اِس سے ثابت ہے کہ بُدھ نے اپنے پیروؤں کو جنہوں نے دنیا کو چھوڑ دیا تھا بُرائی سے روکنے کے لئے کسقدر سخت احکام اور فرمان جاری کئے تھے۔ ہر ایک دنیا دار آدمی کو بھی انہی قواعد پر کاربند رہنا چاہئے۔

یہاں پر صرف چند باتیں بیان کی گئی ہیں ورنہ بُدھ جی مہاراج نے جو کچھ دھرم کے بارہ میں وقتاً فوقتاً تلقین کیا ہے اگر ان سب کو لکھا جائے تو اخلاق کی کئی عمدہ کتابیں

بن سکتی ہیں۔ انگریزی دانوں کے لیے بہتر ہوگا کہ ایک کتاب مسومہ "دی گوسپل آف بدھ" یعنے بدھ کی مقدس کتاب جو پال کیرس نے تالیف کی ہے اور جو مقام شکیگو میں اوپن کورٹ پبلشنگ کمپنی کی طرف سے چھپی ہے اور جو لنڈن میں کگن پال۔ ٹرینچ۔ اور ٹربنر اینڈ کو سے مل سکتی ہے۔ اُسکی چھٹی ایڈیشن ۱۹۰۵ء کو بغور پڑھیں اور حظ اُٹھائیں۔ اس مضمون میں اکثر باتیں اسی کتاب سے اقتباس کر کے لکھی گئی ہیں۔ آج کل کے نوجوانوں کے لیے اس کا پڑھنا نہایت مفید ہوگا کہ اس سے اُن کی طبیعتیں رُوحانی دُنیا کی طرف زیادہ میل کرینگی اور بُرائیوں سے ہٹکر نیکی کی طرف رجوع ہونگی۔

بدھ جیسے ریفارمروں کی دُنیا میں بہت کچھ ضرورت ہے +

م - ل

ایذائے حیوانات

احباب میں اپنے اُسے شامل نہ کروں گا — اطوار خجستہ ہوں کہ فہمید مہیں ہو
ق
بے اس کے "ضرورت کوئی مجبور کرے" جو — روندے کسی کیڑے کو جو ہو راہگذر میں
غفلت کا قدم ایک کچل سکتا ہے جھینگر — جو وقتِ پگہ رہگذرِ عام میں رینگے
ق
پر ہوگی شرافت جسے وہ آگہی پاکر — ٹک ہٹ کے چلیگا اُسے مرجانے نہ دیگا
ق
اِک رینگتا کیڑا جو ہو مکروہ نظر میں — جو ساتھ ہی شاید ہو بھرا زہرِ ستم سے
آجائے اگر ملنے کو بن پوچھے پچھائے — خاموشی و آرام کی پاکیزہ جگہ میں
ق
اور ہاتھ سے اِک شخص کے مرجائے تو مرجائے — اِلزام نہیں امر ضروری میں کسی پر
ق
"ایسا نہیں" جب اپنی ہی خاص حدوں کے اندر — بے جرم و خطا پھرتے ہیں وُہ کھاتے ہوا کو
حق انکا وہاں ہے وہ ہیں مختار وہاں کے — جو اُن کو ستاتا ہے وُہ ملزم ہے گنہ کا
دخل اپنے تئیں دیتا ہے فطرت کی نسق میں — جس نے اُنہیں رکھا ہے کسی اپنی غرض کو

(ترجمہ از ولیم کوپر)

(نذیر حسین احمد انبالوی)

تبادلۂ خیالات

۲

(از مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر)

حِسّی - احساسِ بصر - سمع - خیال - غور اور قیاس سے متعلق ہے - بہت سے واقعات کو ہم نظری اور سمعی طور پر محسوس کرتے ہیں - اور اکثر کو خیالی اور قیاسی طریق سے کوئی سا طریق ہو - ہر ایک حالت اور ہر ایک طریقِ عمل میں بالاحساس تبادلہ خیالات کا ہوتا رہتا ہے - ایک حالت کے احساس کے ساتھ ہی ہمارے رگ و پے میں ایک قسم کی حرکت طاری ہوتی ہے - اور ہم اپنے دل میں ایک نئی قسم کا جوش پاتے ہیں - اس حرکت اور اس جوش سے ہم واقعی ایک طاقت اور ایک عمل حاصل کرتے ہیں - وہ جدید طاقت یا وہ جدید عمل ہمارے دماغ پر بمقابلہ دیگر محصولہ صورتوں کے ایک اور ہی اثر کرتا ہے جو اپنی ذات میں متمیز ہوتا ہے - یہی صورت اور یہی حالت ایک حسّی تبادلہ ہے - ہر ایک قسم کا احساس ایک قوی الاثر عمل ہے اور وہ قریباً ہر ایک طاقتِ انسانی سے وابستہ ہے -

لمسی - ہم بہت سی حالتوں اور کیفیتوں کو قوتِ لمس سے پاتے اور دریافت کرتے ہیں اور اس عمل سے تبادلۂ خیالات صورت پذیر ہوتا ہے -

وجودی - وجودی تبادلہ وہ ہے جو بہ حیثیت ایک وجود یا ایک حسّ کے عمل پذیر ہو خواہ وجود محسوس بالوجود ہو اور خواہ محسوس بالمعقول - اس قسم کا تبادلہ ناگہانی یا اتفاقی نہیں ہوتا ہے - بلکہ ارادی - ہم ایک خیال کو ایک دوسرے شخص کے روبرو بہ حیثیت ایک کلیہ ایک مسلّمہ کے پیش کرتے ہیں اور اسکو بہ دلائل مناتے ہیں - یہ ایک وجودی تبادلہ

ہے۔ ایک چیز یا ایک شے کسی شخص کو دیتے اور اس سے کوئی اور شے پاتے ہیں۔ یہ ایک حسّی تبادلہ ہے۔ ان دونوں صورتوں میں انسان کے دل و دماغ پر ایک فوری اثر ہوتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اثر کس قدر عرصہ تک قائم رہے۔

خیالی۔ تبادلہ کی یہ قسم باعتبار ایک عام اصول کے تمام قسم کے تبادلوں پر حاوی ہے۔ کوئی قسم لیجاوے وہ تخیل کے عمل سے خالی نہ ہوگی گویا یہ شق تمام اقسام کی جامع ہے۔ ہم نے اوپر تشریح نہیں کی ہے اس شق میں کئے دیتے ہیں کہ تبادلہ بلحاظ ذاتی قوتوں کے مندرجہ ذیل صورتیں رکھتا ہے۔

اِتّفاقی۔

اِرادی۔

اتّفاقی۔ وہ حالتیں ہیں جو ناگہاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ہم عام طور پر بلا کسی تخصیص کے جو کچھ دیکھتے اور جو کچھ کہتے سنتے ہیں۔ یہ سب اتفاقی حالتیں ہیں۔ جب ہم ارادتاً کوئی بحث کرتے یا معلومات بڑھاتے یا کسی امر کی تفتیش اور ادراک میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ ایک ارادی صورت ہے۔

اِن صورتوں کے سوائے کہ جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ یہ شق وہم اور ظن پر بھی حاوی ہے۔ خیالی حالتوں سے خیالات کا اظہار ہی مراد نہیں ہے۔ بلکہ ظنّی اور وہمی صورتیں بھی مزعوم ہیں۔

اگرچہ دنیا میں ہر ایک قسم کے تبادلہ کی ضرورت اور وجود پایا جاتا ہے لیکن اس بحث میں ہماری اعلیٰ غرض خیالی تبادلہ سے ہی ہے۔ درحقیقت تبادلۂ خیالات سے ہی انسانوں کی معاشرت اور معاد پر ایک غیر محدود اور قوی اثر پڑتا ہے۔ گو ہم نے اس شق کو خیالی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ مگر در اصل یہ حقائق کا تبادلہ ہے۔

(۴) اب ہماری بحث کا رُخ بدل گیا اور اس تبدیلی سے ہم یوں کہیں گے کہ دنیا کے

حقائق - عمدگیاں - اور غیر عمدگیاں - تبادلۂ خیال کے ذریعہ سے خواہ وہ کسی قسم سے ہی کیوں نہ ہو - ایک جگہ سے دُوسری جگہ میں اتفاقی یا ارادی طریق سے منتقل ہوتی ہیں - اور صرف تبادلۂ خیال ہی اس انتقال کا قوی باعث ہے -

حقائق ہمیشہ اِدھر اُدھر آتے جاتے اور تبادلہ پذیر ہوتے ہیں اور اس تبادلہ کی وجہ سے ملکوں اور قوموں میں شائستگی اور تہذیب یا خرابی اور نقص کی بنیادیں پڑتی ہیں - یہ بحث طلب ہے کہ انتقالِ حقائق یا تبادلۂ خیالات کی صُورت عملاً کیونکر واقعہ ہوتی ہے -

اس کی یہ صُورتیں ہیں -

(الف) انسانوں کا اختلاط اور میل جول -

(ب) سیاحت یا سفر -

(ج) تجارت -

(د) مذہب -

(ھ) حکومت -

انسان ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے ہیں کوئی سیاحت اور سفر کے ذریعہ سے مختلط ہوتا ہے اور کوئی تجارت اور حکومت یا مذہب کے وسائل سے اثر ڈالتا ہے - یہ سب حالتیں بجائے خود قوی الاثر ہیں - زبردستی اور جبر سے اوّل تو کوئی تبادلہ خیالات ہوتا نہیں اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کا اثر اور اُس کی بُنیاد بہت ہی کمزور اور بودی ہوتی ہے -

جن لوگوں نے قوموں کی تاریخی حالتوں کو غور کی نگاہوں سے دیکھا ہے - وُہ اِس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ جبری تبادلۂ خیالات کا اثر آخر کس حیثیت سے ظاہر ہوتا رہا ہے اور وُہ کہاں تک موثر ثابت ہو چکا ہے - کچھ شک نہیں کہ بعض دفعہ حکومتیں

بعض خیالات کو منوالیتی ہیں اور مذہبی جوش کا اثر ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسی حالتوں کو قیام اور ثبات نصیب نہیں۔

وُہی تبادلۂ خیالات قوی الاثر ثابت ہوتا ہے کہ جو بلا کسی جبر اور جوش کے بتدریج ہوتا چلا جاوے۔ ایسی حالت میں لوگوں کو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ اُن کے دلوں اور دماغ میں کیا کچھ صُورتیں اور نقوش منعکس ہو رہے ہیں۔ مخلوق خُدا میں باہمی نفرت محبت عداوت۔ بیزاری کی گرم بازاری چلی جاتی ہے مگر تبادلہ خیالات کی حکومت کا سکّہ ایک دلاویزی اور خاموشی کے ساتھ کس و ناکس اور نافرد شائق کے دل و دماغ پر جمتا چلا جاتا ہے۔

قومیں ایک دُوسرے سے نفرت کرتی اور فرقے ایک دوسرے کو بُرا سمجھتے ہیں لیکن جن حقائق اور جن خیالات کو اُن کے دلوں اور اُنکے دماغوں اور اُن کے وطن اور اُن کے ملک پر پھیرا شروع ڈالنا ہے۔ وُہ ایک خاموشی اور سلامت روی سے موثر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

(۵) لوگ ایک دُوسرے کو مطعون کرتے اور بُری نظروں سے دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک کا جادو دُوسرے پر نہ چل جاوے۔ ایک دوسرے کا معمول نہ ہو سکے۔ یہ سیلاب روکنے سے رُکتا نہیں۔ دنیا اپنی دھن میں لگی رہتی ہے اور تبادلۂ خیالات کی بجلی چپکے سے اپنا کام کرتی جاتی ہے۔

ہر زمانہ میں قوموں۔ نسلوں۔ لوگوں نے تبادلۂ خیالات کی اثر پذیری سے نفرت ظاہر کی تھی اور اس عمل کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا مگر زمانہ نے اپنی چال نہ بدلی۔ آخر ثابت کر کے دکھا دیا کہ تبادلہ ہو کے رہنا تھا۔ یہ ایک شدنی تھی۔

دل۔ دماغ۔ زبان سب اُسی رنگ میں رنگے گئے۔

تاجروں۔ سیاحوں۔ حاکموں۔ اور فاتحوں نے کوششیں کیں کہ مفتوحہ قوموں کے

آثار اور خیالات اُن پر موثر نہ ہوں - مفتوحہ قوموں مفتوحہ نسلوں مختلطہ لوگوں نے بہتیرے زور مارے کہ اس رَو سے محفوظ رہیں - لیکن جن جن خیالات کا عکس پڑنا تھا پڑکے ہی رہا - قوموں اور فرقوں نے مخصوص فرقوں کو جدا کر کے بھی دیکھ لیا تب بھی یہ ہَوا نہ رُکی -

بے قید ہیں پائے طلبِ علم و کمالات رُکتا نہیں ہو کر کبھی ہالہ میں قمر بند

شہروں کے نقشے - آبادیوں کے نمونے - لباس کی تراش خراش - لوگوں کی چال - ڈھال - نشست برخاست - میل جول - امنگ اور آرزو یہ سب چیزیں کہے دیتی ہیں کہ تبادلۂ خیالات کے اثرات نے کہاں تک نفوذ کیا ہے اور کس عمدگی و خاموشی سے دیارِ قلوب پر یہ اثر اور یہ عمل ہو رہا ہے - مان لیا جاویگا کہ کسی پر کم اور کسی پر زیادہ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ کم و بیش معمول ہر ایک ہے -

(۶) تبادلۂ خیالات یا انتقالِ حقائق نہ تو ہمیشہ سود مند ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی سود مند تبادلہ یا انتقال ایک حقیقت کی حقیقت یا ایک امر کی اصلیت کو تبدیل نہیں کرتا جس حیثیت اور جس حقیقت سے کوئی حقیقت ہوتی ہے اسی حیثیت سے منتقل ہوتی ہے - ہاں یہ دوسرا امر ہے کہ اس کی اصلیت کو باسباب دیگر اور حالت پر لایا جاوے - جیسے ہم نے یہ کہا تھا کہ تبادلۂ خیالات درحقیقت حقائق کا تبادلہ یا انتقال ہے - ایسے ہی یہ کہا جاویگا - کہ ایسا تبادلہ یا ایسا انتقال اکتساب حقائق ہے - ہم ہمیشہ اتفاقی یا ارادی طریق پر اوروں سے خود کچھ سیکھتے اور انکو کچھ سکھاتے بھی ہیں -

معیارِ تبادلہ - یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ ایسے تبادلۂ خیالات کا باعتبار سود مندی یا ناسود مندی کے معیار کیا ہے - ہماری رائے میں تحقیقِ حق کے واسطے جو جو اصول اور ضوابط عام طور پر مقرر ہیں - وہی تبادلہ خیالات کا معیار بنا سکتے ہیں -

تبادلہ خیالات کی کیفیت اس امر کی متلزم نہیں کہ ہم سرسری طور پر یا ایسے تبادلہ کی

ساتھ ہی ایسے خیالات متبدلہ کے تسلیم کرنے کی آمادگی ظاہر کریں یا اُن سے محترز ہوں ہمیں ضرور ہی کہ اُسی ضابطہ اور اُسی قاعدہ سے اُنکو بھی دیکھیں اور پرکھیں جو ضابطہ اصولاً تحقیقِ حق کے لئے مرعی ہی۔

ہم اپنے سلسلۂ زندگی میں اکثر تغیرات کو دیکھتے اور اکثر تبدلات کو پاتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اکثر ہوائیں آتی اور ہمیں چھُو کر کے گذر جاتی ہیں۔ کیا یہ ضرور نہیں ہے کہ ہم اُن سب کو غور کی نگاہوں سے دیکھیں اور سود مندی یا ناسود مندی کے اعتبار سے اُن کا خیر مقدم کریں یا اُن سے بچیں اور سوچیں کہ اُن میں سے کون حالت یا کون کیفیت مناسب ہی اور کون نامناسب۔

وُہ شخص جو ایک شاہ راہ پر بیٹھے بیٹھے تمام گذرنے والوں کو ہی اپنا رفیق یا حریف قرار دیتا ہے وُہ اپنے اور اپنے حالات کے واسطے سچّا فیصلہ نہیں کرتا۔ وُہ اپنی زندگی کو ایک جھمیلے میں ڈالتا اور اپنے اغراض کو گرداب ناکامیابی میں دھکیلتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اُن گذرنے والوں سے کون اس کی طبیعت اور اُس کے حالات کے موافق ہی اور کس کو اُس سے مغائرت اور منافرت ہی کیا ایسا جلد بازیہ کہہ سکتا ہی کہ میں نے تمیز سے کام لیا ہے۔

ہم ہمیشہ سُرعت سے خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ ہمارے دماغ سے کچھ خیالات دوسرے دماغوں میں حلول کرتے ہیں اور کچھ دوسرے دماغوں سے نکل کر ہم میں آتے ہیں۔ ہمارا فرض ہی کہ ہم جو کچھ پاتے ہیں اُسے میزانِ عقل میں وزن کرنے کے بعد قبول یا رد کریں اور محکِ سود مندی اور ناسود مندی پر پرکھیں۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جو جو خیالات یا جو جو آثار اَوروں سے لئے جاتے ہیں۔ وہ بہ ہیئت مجموعی حقائق کا درجہ رکھتے ہیں یا وہ حقیقتاً حقیقت سے معرّا محض ہیں۔

بہت سے خیالات اس قسم کے ہم اَوروں سے پاتے ہیں کہ وُہ اپنی ظاہری چمک

ونگ کے اعتبار سے فی الواقعہ خوشنما ہیں۔ حقیقت الامر میں گو وُہ اَوروں کے حق میں گونہ سودمند ہوں لیکن ہمارے کوائف کے مخالف ہوتے ہیں۔ اُن کی خوش نمائی توہمیں اُنکے اخذ پر مجبور کرتی ہے لیکن اپنے کوائف کی مخالفت مانع ہوتی ہی۔ ایسی حالت میں ہمیں پُورے حزم و احتیاط اور تامل سے کام لینا چاہیئے۔ اگر ہم بلا غورِ مزید انکو اپنا دستور العمل بنا لینگے تو یقیناً ہمیں ایسے ناسُودمند عمل سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور ہم ایک ایسی راہ اختیار کرینگے جو ہماری منزلِ مقصود کو نہیں جاتی ہی۔

(۸) عام اصُول کے لحاظ سے ہمارے خیال میں ہر ایک متبدلہ خیال کی سودمندی اور ناسودمندی کا معیار مندرجہ ذیل امور ہوسکتے ہیں۔ اگر ان امُور کے لحاظ سے اُن کا اخذ یا ترک عمل میں آویگا تو ہمیشہ کامیابی کا پلّہ بھاری رہیگا۔

(۱) اس کی ضرورت۔

(۲) اپنی موجودہ حالت سے مقابلہ۔

(۳) اس کی حقیقت اور اس کا ثبوت۔

(۴) اس کی وسعتِ سودمندی۔

ہم تبادلہ میں اَوروں سے یہ خیال لیتے ہیں کہ ہماری طرزِ معاشرت اس اصُول پر پہنچنی چاہیئے اور ہماری طرزِ زندگی ان لوازمات سے زیادہ تر مفید اور روشن ہوسکتی ہی اس سے پہلے کہ ہم ان تازہ اصُولوں پر عمل کریں۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ انکی ہمیں ضرورت کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہماری پہلی یا موجودہ طرزِ معاشرت کیسی ہی۔ اسکی حقیقت کیا ہے اور اس کا ثبوت کیسی دلائل اور کن واقعات پر مبنی ہے۔

وُہ بلحاظ اپنی سودمندی کے کیسے اصُول ہیں۔

اگر ان مراتب کے اعتبار سے وُہ پُورے اتریں تو اُن کے اختیار کرنے اور معمُول بنانے میں کوئی قباحت نہیں اور اگر ان شرائط کے منافی ہیں تو اس اخذ

فضول کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بحث کہ وُہ اَوروں یا بعض دیگر افراد کے واسطے اچھے اور سود مند ہیں ایک دوسری بات ہے۔ بہت سی حالتیں اَوروں کے مناسبِ حال ہیں۔ لیکن ہمارے لئیے اُن کا وجُود اور ان کا عمل موزون نہیں +

جنّت الفردوس

(ماں بچّہ کا مکالمہ)

بچّہ۔ پیاری امّاں! مَیں اکثر تمہیں جنّت الفردوس کا تذکرہ کرتے سُنتا ہُوں۔ تم وہاں کے ساکن بزرگوں کو شادمانی مجسّم نام دیتی ہو۔ آہ۔ وُہ وادیٔ پُربہار کہاں ہے؟ کیا ہم اُسے تلاش نہیں کرسکتے۔ کیا ہم اُسے گریہ وزاری۔ شیون وبکا۔ نالہ وفریاد سے حاصل نہیں کرسکتے؟ کیا یہ وہاں ہے جہاں نارنگی کے شگوفے کھل کر تمام گردو پیش کو عطر آگین بنا دیتے ہیں اور جہاں کرمِ شب تاب کی چمک مسرت بخشِ دلہا ہوتی ہے۔

ماں۔ نہیں۔ میرے لختِ جگر وہاں نہیں۔

بچّہ۔ کیا یہ وہاں ہے جہاں کھجوروں کے درخت آسمان سے پیش کرتے ہیں اور اپنا لطیف ولذیذ پھل اہلِ عالم کے لئیے مہیا کرتے ہیں یا سمندر کے اُن دلاویز اور خوشنما جزیروں میں جہاں لہلہانیوالے نظرفریب سبزہ زاروں میں نسیمِ عنبر شمیم ہر چہار طرف اٹھکیلیاں کرتی ہے اور عجیب وغریب پرندے اپنے سُنہری دلفریب پروں پر اُڑتے ہوئے اپنی اپنی دلکش راگنیاں گا کر چمنستانِ قدرت کے گل چینوں کو محوِ حیرت بناتے ہیں۔

ماں۔ نہیں اَے جانِ مادر وہاں نہیں۔

بچّہ۔ کیا یہ اُن نامعلوم طبقاتِ ارض میں ہے جہاں کہ دریا ریگِ زر پر لہریں لیتے ہیں۔ جہاں یاقوتِ احمر تیزی سے چمکتا ہے اور الماسِ بےبہا بکثرت پایا جاتا ہے یا وہاں جہاں ساحلِ مرجان پر گوہرِ یکتا اپنی دلکش چمک دکھاتا ہے۔ ہاں پیاری اماں بتاؤ کیا گلزارِ جناں وہی ہے۔

ماں۔ اے میری رُوح وہاں نہیں۔ انسانی آنکھ نے کبھی اس کے دلکش نظاروں کی سیر نہیں کی۔ کسی کان نے بھی ہاں کے ترانہائے شادمانی کو نہیں سُنا۔ اس راحت افزا مقام کا تصوّر تک بھی ہم اپنے خواب وخیال میں نہیں لاسکتے۔ غم اور موت کا وہاں کوئی کام نہیں۔ خوف وہراس وہاں سے کوسوں بھاگتے ہیں۔ یاس وناامیدی کا وہاں کچھ پتہ نہیں۔ کوئی ایسی تمنا نہیں جسے وہاں کے ساکنین اپنے دلوں میں لائیں اور وہ پوری نہو۔ اُس خوشی کی سرزمین پر وقت بھی اپنا کچھ اثر نہیں ڈال سکتا۔ ہاں بادلوں اور قبر سے پرے جاؤ تو تم وہاں اُسے پاؤ گے +

(مفتی غلام جعفر فرخ از فیروزپور)

متروک الفاظ

(۳)

ہم نے یہ پہلے ہی بیان کر دیا ہی کہ کسی لفظ کا ترک کرنا صرف اُسوقت جائز ہو سکتا ہی جبکہ اس کے حروف میں کسی قسم کا ثقل موجود ہو۔ مثلاً شاہ مبارک آبرو نے اپنے دیوان میں "آنسوؤں" کی بجائے جو "انجھواں" استعمال کیا ہی۔ اِسکا ترک کرنا بالکل بجا ہے کیونکہ "انجھو" سے "آنسو" کہیں زیادہ سبک و لطیف ہی۔ لیکن اسی بنا پر "کبھو" یا "کسو" کو چھوڑ دینا بڑی غلطی ہی۔ "کسو" اور "کسی" میں سوا اس کے اور کچھ فرق نہیں ہی کہ ایک میں حرف سین مضموم ہی۔ اور ایک میں مکسور کیونکہ "و" اور "ی" کا فرق تو اسی اختلاف حرکات کا نتیجہ ہے۔ اور یہ فرق کوئی بڑا فرق نہیں ہی کیونکہ اس سے سلاستِ لفظ میں ذرا بھی ترقی نہیں ہوتی۔ اور جب یہ نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان الفاظِ قدیم کو چھوڑ کر اپنی زبان کو اُن کے اِستعمال سے محروم کر دیں۔

میری رائے میں "کبھی" اور "کسی" کے ساتھ "کبھو" اور "کسو" کا بھی استعمال ضرورت کے موقعوں پر جائز ہونا چاہیے۔ مثلاً مطلعہائے غزل میں اس قسم کے قوافی کی اکثر ضرورت پڑتی ہی۔ اور ایسی حالتوں میں صرف متروک ہونے کے لحاظ سے ان الفاظِ عزیز سے اِحتراز کرنا اُنپر بڑا ظلم ہے۔

میر صاحب کے زمانہ سے لیکر مومن و غالب و بعض شاگردانِ مومن تک انکا استعمال بہت عام تھا لیکن شیخ ناسخ کی زور آزور یوں نے یہ بہت بُرا کیا کہ خواہ مخواہ اِن غریبوں کو نکال باہر کیا۔

میر صاحب کے شعر کی بیساختگی دیکھنا۔ فرماتے ہیں ؎

دِل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا تاکنا جھانکنا "کبھو" نہ گیا

مصحفی کے مطلع بھی مُلاحظہ ہوں۔ کہتے ہیں ؎

خطرا ہے مجھے اِس دلِ کمبخت کی خو سے ڈرتا ہُوں کہ ہو جائے محبت نہ کسو سے

؎

رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا شعلہ سمجھا تھا اُسے میں پہ بھبھو کا نکلا

جرأت کا اندازِ درد بھی شنیدنی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

بیکس وُہ ہوں کہ نکلی نہ حسرت "کبھو" مری رویگی بعد مرگ مجھے آرزو مری

میرزا غالب کا اندازِ بیان سب سے نرالا ہی۔ فرماتے ہیں ؎

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی لکھدیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بیحوصلگی سے یانتو کوئی سُنتا نہیں فریاد کسو کی

مومن مرحوم کا شعر ہے۔ ؎

کون کہتا ہے دمِ عشق عدو بھرتے ہیں کہ ہوا باندھنے کو آہ کبھو بھرتے ہیں

مرقومہ بالا اشعار میں ایک قسم کی بدگمانی ستم پرور کی گنجائش ہی یعنے اس بنا پر کہ ان الفاظ کے حُسن کی دلنشینی کا ایک یہ بھی سبب ہو سکتا ہی کہ اوّل وُہ مطلعہائے غزل میں واقع ہُوئے ہیں۔ دوم اُنہوں نے ایک پُر لُطف و نازک ضرورت یعنی ضرورت قافیہ کو رفع کیا ہی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مطلعوں کو چھوڑ کر متفرق اشعار میں بھی جہاں کہیں انکا جلوہ نظر آتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ محبوبی بھی اُن کے قدموں پر پڑی لوٹتی ہی تو ہمیں مجبوراً اگرم ستائش ہونا پڑتا ہے۔

خواجہ میر درد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

کیا کہوں دن کا "کسو" سے قصہ آوارگی — کوئی بھی بے ربط ہوتی ہے کہانی اس قدر

مصحفی لکھتے ہیں ؎

اُس گل کی باغ میں جو خنا نے چلائی بات — غنچے نے مسکرا کے کہا ہم نے پائی بات

وُہ مجھ سے اندنوں میں جو کچھ بولتا نہیں — شاید "کسو" نے جا کے اُسے کچھ لگائی بات

میر حسن مرحوم صاحبِ مثنوی کے شعر میں قیامت کی دلچسپی ہے۔ کہتے ہیں ؎

شبِ وصلِ صنم ہے آج اے ہمدم "کسو" ڈھب سے — گریبانِ سحر کو ٹانک دیجو دامنِ شب سے

معترض صاحب فرمائینگے کہ اِن اشعار میں اگر "کسو" کی بجائے "کسی" ہو تو کیا حرج ہے۔ اور حسرت واقفۂ سخن عرض کریگا کہ صاحب یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ نقص کیا ہوگا اور حرج کیا لیکن یہ میرا عقیدہ ہے کہ ان میں "کسو" کی بجائے "کسی" لانے سے وُہ لُطف نہیں باقی رہیگا۔ نہیں رہیگا۔ ہرگز نہیں رہیگا۔

اصل یہ ہے کہ آفرینندۂ سخن نے نظم کے دل میں نہیں معلوم ایسا کیا، وہ رکھدیا ہے۔ کہ اُسی پُرانے الفاظ سے کچھ ایسی محبت ہوتی ہے۔ جسکا بیان تحریر و تقریر سے ناممکن ہے۔ اس کا ثبوت ہر ملک کی نظم میں ملتا ہے۔ اور اِس لئے زبانِ اُردو بھی اِس قاعدہ کلیہ سے مستثنےٰ نہیں ہو سکتی۔

حسرت موہانی

روئے زمین کا سفر

اگر کوئی شخص تمام روئے زمین کا دورہ از راہِ تری کرنا چاہے - تو اُسکو جنوبی سمندروں کے راستے سفر کرنا پڑیگا وُہ جہاز جو انگلستان سے روانہ ہوگا - بحرِ ظلمات سے گذر کر راس امید ہوتا ہوا بحر ہند میں داخل ہوگا اور وہاں سے آسٹریلیا اور نیوزیلنڈ ہوتا بحر الکاہل جنوبی کی وسیع شاہراہ طے کرتا بحرِ ظلمات کی تھپیڑیں کھاتا پھر جزائر برطانیہ میں واپس آجائیگا - چونکہ اس سفر میں صعوبتہائے شاقہ اور تکالیف مالایطاق کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جا بجا قیام کرنے کی وجہ سے بہت سے وقت کا بھی خون ہوتا ہے لہذا ہم ایک اور راہ سے اسی سفر کو طے کرتے ہیں - یہ سفر لورپول سے شروع ہوتا ہے - جسکو انگلستان کا تجارتی دار الخلافہ کہنا بجا ہے - اس شہر کی حیرت انگیز ترقی اُنیسویں صدی کا ایک معجزہ ہے سنہ ۱۷۰۱ء میں یہ شہر صرف ایک چھوٹا سا بندرگاہ تھا جس میں آٹھ ہزار باشندوں کی آبادی تھی - ایک صدی کے اندر اندر اس کی آبادی ۷۷۰۰۰ ہوگئی - اور آجکل اُس کی آبادی سنہ ۱۷۰۱ء کی آبادی سے قریب قریب نوّے گنا ہے - جزائر برطانیہ میں یہ دُوسرے درجہ کا شہر ہے - مگر تجارتی بندرگاہ کی حیثیت سے دُنیا میں یہ اپنا نظیر آپ ہی ہے - اس کی لنگرگاہیں سات سو ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہیں اور اِس کے گھاٹ سترہ میل تک چلے گئے ہیں -

ہمارا جہاز لورپول سے روانہ ہوکر مُرغِ آبی کی طرح سطحِ سمندر پر فراٹے بھرتا چلا جا رہا ہے - دھیمی دھیمی ہوائیں بادبان سے شوخیاں کر رہی ہیں - بحرِ ظلمات کی لہریں ہمارے قدم لے رہی ہیں - نظارہ کچھ ایسا دلکش اور دلفریب ہے کہ آسمان بھی کچھ عرصہ کے لئے اپنی سرد مہری بھلا بیٹھا ہے اور لب ہائے اشتیاق جھکا کر سمندر کی پیشانی پر بوسہ دے رہا ہے العرض ہمارا جہاز بحرِ ظلمات کی پُرخطر موجوں کو نیچا دکھاتا نو روز کی مسافت کے بعد نیویارک

میں لنگر ڈالتا ہے۔ دریائے ہڈسن اس شہر پر دانت پیس پیس کر رہ جاتا ہی اور جب کچھ پیش نہیں چلتی تو بحر ظلمات کی ظلمت میں کُود کر فنا ہو جاتا ہے۔ یہ شہر ایک جزیرہ پر آباد ہے جسکا رقبہ ۲۲ مربع میل ہی۔ اِس گوشۂ عافیت پر کھڑا ہو کر شہر دریائے ہڈسن کے پیچ و تاب کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہی اور بحر ظلمات کی موجوں پر طعنہ زن ہوتا ہے جو اپنا سر اسکے قدموں پر ٹکرا ٹکرا کر رہجاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہی کہ اگر اس شہر کو بحر ظلمات کی ملکہ کہیں تو بجا ہے۔ یہ شہر مغربی دنیا کا لورپول ہے۔ ممالک متحدہ کے مشرقی کنارہ پر نیویارک واقع ہے اور مغربی کنارہ پر سان فرانسسکو۔ ان دونوں شہروں کو پیسفک اینڈ اٹلانٹک لائن ملاتی ہے۔ یہ عظیم الشان لائن ۳۲۱۵ میل لمبی ہی۔ نیویارک سے سوار ہو کر ساڑھے چھ دن شبانہ روز سفر کرنے کے بعد سان فرانسسکو پہنچ سکتے ہیں۔ اِس سفر میں ہر قسم کے سین نظر آئینگے۔ نباتات کے مختلف منطقوں اور تہذیب و شائستگی کے ہر طبقہ میں سے ہو کر گذرنا پڑیگا کہیں دیکھینگے کہ سینکڑوں میل تک سرسبز و شاداب کھیت ہماری نظروں کے سامنے اُڑے چلے جاتے ہیں۔ کہیں ریل اُن وسیع غیر مزروعہ مگر ہرے بھرے میدانوں میں سے ہو کر گذرتی ہی۔ جو سوائے امریکہ کے اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ کہیں میلوں سنگلاخ زمین چلی گئی ہی۔ کبھی ریل بلند ہوتی ہوتی ایک خال بدنما کی طرح کسی پہاڑ کی پیشانی پر نمایاں ہوتی ہے اور پھر گویا اس گستاخی کے پاداش میں سر عجز خم کر کے عمیق گھاٹیوں میں اپنی پستی پر آہِ جگر سوز بھرتی چلی جاتی ہی۔ کوہ راکی کی بلند عزلت گاہ بھی اس مرکبِ آہنی کے جولانگاہ ہونے سے محفوظ نہ رہی۔ ایک مقام پر تو ریل سطح سمندر سے ۸۲۴۲ فیٹ کی بلندی تک اُونچی ہو گئی ہی۔ اس سے زیادہ بلندی پر ریل آج تک دُنیا کے کسی حصّہ میں نہیں گئی۔ اِن بلند مقامات میں ریل کو برف سے محفوظ رکھنے کے لئے مضبوط شہتیروں کی سلامی دار چھت بنائی گئی ہی۔ بعض مقامات پر پہاڑ کو برما کر سڑک بچھا دی ہی۔ اس طرح میلوں تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم سرنگ میں سفر کر رہے ہیں۔

اس لائن کے چار بڑے حصے ہیں۔ پہلا حصہ نیویارک سے چکاگو تک جاتا ہے۔ چکاگو اضلاع غربی کا تجارتی مرکز اور نیویارک سے ۳۰ گھنٹہ کی مسافت پر جھیل میچیگن پر واقع ہے۔ اس شہر کی ترقی نیویارک کی ترقی سے بھی کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں اس کی آبادی محض ۵۰۰ متنفس کی تھی لیکن ایک ہی پشت کے اندر اندر اس کی آبادی تین لاکھ کی ہوگئی۔ دنیا بھر میں اس سے بڑھ کر غلہ اور لکڑی کی منڈی کوئی اور نہ تھی مگر افسوس زمانہ کی نظر بد نے اس شہر کو محفوظ نہ رکھا۔ سنہ ۱۸۷۱ء کی آتش زدگی نے ماسکو کی آتش زدگی کو بھی بھلا دیا۔ اس سے اس شہر کا ایک تہائی حصہ جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔

دوسرا حصہ ۵۰۰ میل لمبا چکاگو اوراوماہا کو وصل کرتا ہے۔ لائن کے اس حصے پر بہت سے خوشنما قرے اور شہر واقع ہیں۔ جن کی ترقی اور شوکت کا زمانہ دامن استقبال میں پوشیدہ ہے۔ اسی راہ میں کوئلے کی بڑی بڑی کانیں اور غلہ کی منڈیاں نظر آئینگی جو اس سرزمین کی آیندہ ترقی کی ضامن ہیں۔ اس حصہ میں سب سے زیادہ مشہور شہر برلنگٹن ہے جو دریائے مسیسپی کے کنارے پر آباد ہے۔ اوماہا دریائے مسوری کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس شہر کی ابتدا سنہ ۱۸۵۴ء میں ہوئی۔ لیکن اس مدت قلیل میں ہی اس کی مردم شماری ۲۵۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ ہماری رائے میں عنقریب وہ زمانہ آنیوالا ہے کہ اضلاع غربی اس پر ناز کرینگے۔

اوماہا سے مغرب کیطرف وسیع سبزہ زاروں کی سرزمین ہے جنکو پریری کہتے ہیں۔ سبزۂ زمردیں ان میدانوں کی وسعت دشادابی پر لوٹا ہوا ہے۔ اس سبزے کی دلفریب ادائیں اور جانبخا ہوا کے جھونکوں کی پھولوں سے دستبازیاں دل پر وہ عالم سرور پیدا کرتی ہیں جسکے بیان سے زبان قلم عاجز ہے۔ عودسان سبزہ زار اپنے خواب ناز سے بیدار ہوکر ہمہ تن چشم بنی نگاہ شوق سے ہماری آمد آمد کے انتظار میں سروقد استادہ ہیں۔ جب ہمارا مرکب دخانی اس دلفریب منظر کے اشتیاق میں ہانپتا

اور خوشی کے نعرے بلند کرتا قریب پہنچتا ہے تو بفحوائے الحیاء من الایمان - دوشیزگانِ عفت پناہ عصمت کدۂ لم یزلی اپنا سر مارے شرم کے جُھکا لیتی ہیں اور مقنعہائے اطلسین سروں پر ڈالکر سبز آنچل کی آڑ سے جھانک جھانک کر دیکھتی ہیں - نسیم سحری پر تاکید ہے کہ جا جلد جا - اور خوشبوؤں کی کشتیاں ان رہ نوردانِ غزلت کدۂ قدرت پر نثار کر - ای صلّ علیٰ - ان جھونکوں نے دشت و بیابان - کوہ و صحرا سب کو معطّر کر دیا - اے نازپروردگانِ آغوشِ تنہائی و اے پردہ نشینانِ قصرِ زمرّدین - سچ بتا دو یہ آئینِ مسافر نوازی تم نے کہاں سے سیکھے - ان کم سخن نازنینوں کی خاطر و مدارات کا ذکر کہاں تک کیا جائے - سبزہ ہے کہ ایک طرف بچھا چلا جاتا ہے - نغمہ سرایانِ قدرت ہیں کہ لحنِ داؤدی میں ترانہائے خیر مقدم گا گا کر ہم پر نثار ہو رہے ہیں - آہوانِ خوشخرام کی ڈاریں ترچھی نگاہیں پھینک پھینک کر اُچھلتی کودتی چوکڑیاں بھرتی چلی جاتی ہیں - البتّہ دریا ہماری مداخلت بیجا سے مکدّر و نالاں دشت و بیابان کو اپنی شکوہ و شکایت کی داستان سُناتا چلا جاتا ہے - ناگاہ بادِ صرصر کی تھپیڑوں نے اُس کی زبان درازیوں کے پاداش میں اُس کا نقشہ بگاڑ دیا - اب نہ وہ جوش ہے نہ خروش اپنے کئے پر پشیمان اور اپنی بے آبروئی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا عرقِ ندامت میں ڈوبا مُہرِ سکوت لگائے چلا جا رہا ہے - اَے نو رسیدگانِ گلشنِ عصمت تمہاری عنائتیں لوحِ دل پر کندہ ہو چکی ہیں - خوش رہو - پھُولو پھلو - سرسبز ہو -

سیر کئے پھُول چُنے - خوش ہُوئے - دلشاد رہے
باغباں جاتے ہیں - گلشن ترا آباد رہے

الغرض اِس خطۂ جنّت نشان کو خیرباد کہتے ہم کوہ راکی کی دشوار گذار گھاٹیوں کا سفر شروع کرتے ہیں - اوماہا اور اگڈن کی نصف راہ میں ہی وہ بلند مقام واقع ہے جسکا ذکر اُوپر ہو چکا ہے - امریکہ کے ایک مشہور سپہ سالار کے نام پر اسکا نام شرمن رکھا گیا ہے - ۵۰۰ میل تک ریل سطحِ سمندر سے ۶۵۰۰ فیٹ اُونچی چلی گئی ہے - اگڈن سے ۴۰ میل اس طرف ریل اُس گھاٹی

میں داخل ہوئی ہے جسکا نام ایکوکریک ہے - اس سے بڑھ کر حیرت انگیز سین اس تمام سفر میں کہیں نظر نہ آئیگا - شان اسکی یہ ہے کہ ایک نہایت عمیق - پتھریلا - ناہموار نالا سات میل تک پیچ وتاب کھاتا چلا گیا ہے - اس کی چوڑائی بعض مقامات پر آدھ میل اور بعض پر پون میل ہے دائیں طرف ۲۰۰ فیٹ سے ۸۰۰ فیٹ تک کی اونچی ڈھالو پہاڑیاں پرے جمائے کھڑی ہیں ان کی پشتہ بندی صانعِ قدرت نے اپنے دستِ اعجاز سے کی ہے - جس کی صنعت پر طبیعت بیساختہ لوٹی جاتی ہے - زمانے کی اکھاڑ پچھاڑ کرنے والی رفتار نے اپنا سکہ ان پہاڑوں پر بھی بٹھا دیا ہے - بارشوں اور جنوبی ہواؤں کے صدمات سے بعض مقامات پر پتھر گھس گئے ہیں - سبزہ ان پہاڑیوں کو مسکن پرخطر سمجھ کر ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکا ہے اور مقابل کی پہاڑیوں پر اپنی صفیں آراستہ کئے طوفانِ حوادث کی ستم شعاریاں دیکھ دیکھ کر کھلا جاتا ہے سچ ہے - ؎

کوئی نا امیدی سے ہے جاں کنی میں
کوئی دیکھتا ہے تماشا کسی کا

ان دونوں پہاڑیوں سے مصافحہ کرتی ایک نہایت شفاف ندی منافقینِ ستم کیش کی طرح انکی بیخ کنی میں شبانہ روز مصروف اور ان کی جڑوں میں پانی دینے پر تلی ہوئی مارِ آستین کی طرح لہرائی چلی جاتی ہے - اس گھاٹی کے وسط میں دونوں پہاڑیاں دو بچھڑی ہوئی بہنوں کی طرح جن میں سے ایک ہری بھری اور دوسری کو کہہ مانگ جلی ہو فرطِ محبت سے لپک کر ایک دوسرے سے معانقہ کیا ہی چاہتی ہیں کہ آہ اس ظالم سفاک ندی نے للکار کر ان دونو بہنوں کو ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا - ہریالی بہن پر یہ جدائی اس قدر شاق گذرتی ہے کہ اس غریب کا نقشہ بگڑ جاتا ہے - اب وہ تسلسل وتناسب رخصت ہوا یہ فرقت زدہ کہیں مینار کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کہیں کنگرہ کی شکل قبول کر لیتی ہے کہیں اس کی چھاؤں سے برباد شدہ معبدوں کی شان ٹپکتی ہے اور کہیں نگاہ کو برجِ مشیدہ کا دھوکا ہو جاتا ہے - الغرض یہ ستم رسیدہ پہاڑی اس شان سے نظر آتی ہے کہ گویا یہ خطہ کبھی پرستان

ہوگا۔ مگر امتدادِ زمانہ نے اُسکو پتھر بنا دیا۔ ہمارے شعرائے قادر الکلام اور مصوّرانِ معجز نظام کے لیے اس سے بڑھکر اپنی اعجاز نمائیوں کے دکھانے کا موقع بہت کم دستیاب ہوگا۔

لائن اگڈن سے سان فرانسسکو کی طرف جاتی ہو۔ وہ گریٹ سالٹ لیک کی شمالی حد پر سے گذرتے ہُوئے امریکہ کے صحرائے اعظم کو طے کرتی پیسفک الپس کی بلند چوٹیوں کو ٹھکراتی سطح سمندر سے ۷۰۴۰ فیٹ بلند ہوجاتی ہو۔ مگر آخر یہ بلند پروازیاں کہانتک۔ سو میل کی مسافتِ قلیلہ کو دیکھو اور ۰۰۰،۷ فیٹ کے اتار کو ملاحظہ کرو۔ سچ ہے

جنہیں ملا اُنہیں افتادگی سے اوج ملا
اُنہیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اُٹھا کے چلے

اب ہم شہر سکرمینٹو میں داخل ہوگئے۔ یہ شہر کیلیفورنیا کا دار الخلافہ ہو جو معدنِ طلا ہو۔ اسی مقام سے آثارِ مشرقیت ظاہر ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ اس شہر کی آبادی کے ادنےٰ طبقہ میں چینی بکثرت نظر آتے ہیں۔ سان فرانسسکو اس مقام سے قریب ہو۔ بحر الکاہل سے اُسکا نظارہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ یہ شہر خلیج سان فرانسسکو کے غرب میں ایک جزیرہ نما پر واقع ہو۔ اسکا شمالی حصّہ متفرق طور پر خشک اور ریتلی پہاڑیوں پر آباد ہے جن میں سبزے کا نام تک نہیں۔ البتّہ جنوبی حصّہ جسکو شہر کا تجارتی حصّہ بھی کہہ سکتے ہیں باقاعدہ آباد ہے۔ اس میں بڑے بڑے بازار ہیں جو ایک دُوسرے کے متوازی ہیں اور عموماً گھاٹوں تک چلے گئے ہیں۔ سان فرانسسکو میں اکثر چوبی مکانات ہیں۔ لیکن بتدریج انکی جگہ پتھر کی عمارتیں بکثرت بنتی چلی جاتی ہیں۔ ان عمارتوں میں بعض تو نہایت ہی خوشنما اور آراستہ پیراستہ ہیں۔ شہر کی مالی ترقّی کے ساتھ بہت سے خوشنما اور نفیس پتھر کی عمارتیں تیار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اضلاع متحدہ کی تجارتی شہروں میں یہ شہر چھٹے درجہ پہ ہے۔ اگرچہ فی زمانا اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے مگر عنقریب وُہ زمانہ آنیوالا ہو کہ مغربی امریکہ میں اس سے بڑھکر غلہ کی منڈی کوئی نہ ہوگی۔ آب وہوا یہاں کی ایسی خوشگوار ہی کہ جو نازک پودے اضلاع

مشرق میں پائے نہیں جاتے۔ وہ یہاں بارہ مہینے بکثرت پھولتے پھلتے ہیں - اس شہر کی شان و قوع سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیچر اس شہر کی عظمت و شوکت مٹانے پر کمربستہ کھڑی ہے۔ مگر اس جنگ زرگری نے اس سرزمین کو ایسا زرخیز بنادیا ہے کہ اس کی ریتلی گھاٹیوں میں وہ وہ نفیس باغ پوشیدہ ہیں - جن پر باغ ارم بھی رشک کھاتا ہے۔

اب ہمارا جہاز بحرالکاہل کی سست موجوں پر زناٹے بھرتا ذرا کی ذرا یوکوہاما میں قیام کر کے جزیرہ ہانگ کانگ میں جا پہنچتا ہے - یہاں سے از راہ خشکی بھی سفر ممکن ہے۔ مگر سواری اور باربرداری کے سامان مہیا کرنے میں اس قدر دقتیں پیش آتی ہیں کہ مجبوراً اس راہ کو ترک کرنا پڑتا ہے - اور اس راہ کو اختیار کرنا قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ جس پر پائنٹ ڈی گیل - عدن - سویز اور اسکندریہ واقع ہیں۔ اسکندریہ سے براہ برنڈسی - لورپول تک ۲۷ روز کی راہ ہے جن میں سے تین روز سفر بحری میں صرف ہوتے ہیں - زمانہ قدیم میں برنڈسی سلطنت روما کا ایک عظیم الشان بحری مقام تھا - آجکل یہاں سے ایک ریلوے لائن فلورنس ہوتی ہوئی ٹورن تک گئی ہے - ٹورن سے لمبری تک ریل کوہ الپس کو برماتی ہوئی چلی گئی ہے - اسی راہ میں مونٹ سینس کی عظیم الشان سرنگ واقع ہے جس پر زمانہ حال کے انجنیروں کو بڑا ناز ہے - سچ پوچھو تو یہ ناز ہرگز بیجا نہیں - اس سرنگ کو ۱۸۵۷ء میں پہاڑ کی مخالف سمتوں سے کھودنا شروع کیا اور بیس سال کی کوہکنی کے بعد جس کے آگے فرہاد کی کوہکنی منفعل ہوتی تھی - یہ دونوں سمت کے بہادر کوہکن ایک دوسرے سے مل گئے اس سرنگ کو جو آٹھ میل لمبی ہے اور جو ۴ کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوئی ہے - اول مرتبہ ریل نے ۷ ستمبر ۱۸۷۱ء میں طے کیا - یہاں سے پیرس چند گھنٹہ کی راہ ہے اور وہاں سے لورپول پہنچنا کوئی بات نہیں - اس سفر میں ۲۳۰۰۰ میل طے کرنے پڑینگے اور دو ماہ سترہ یوم کے بعد تمام دنیا کا چکر لگا کر لورپول میں واپس آجاؤ گے *

سید شریف حسین بی - اے (الہ آباد)

گُناہ

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

اب تیرا دل ایسا سیاہ ہوگیا کہ تیری شبِ فراق کی تاریکی بھی اس سے چھپتی تھی۔ یہ وہی دِل تھا جو کبھی ایسے چراغ کے مشابہ تھا۔ جسکی روشنی خنک اور ٹھنڈی ہو اور یہ وہی دِل تھا جو اُس مبارک زمین کی طرح تھا۔ جس پر برکتوں کا نور ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح ہر وقت برستا ہو۔ اور اب وُہی جھیل بُرائیوں کا سمندر بنگئی تھی۔ جس میں ایک طرف گناہوں کا دلدل تھا اور دُوسری طرف ناپاکی کی موجیں طُوفان برپا کر رہی تھیں۔ اب وُہی چراغ آگ کے بڑے ڈھیر کی صُورت میں تبدیل ہوگیا تھا جسکے بے پناہ شعلے آسمان تک کی خبر لاتے تھے۔ اور اب وُہی زمین ایسا خشک قطعہ بنگئی تھی۔ جس کے ذرّوں سے پلیدی کے پودے پھُوٹ کر بلند درخت بنگئے تھے اور جن میں نامبارکی اور بدفالی کے پھُول بکثرت کھِل رہے تھے۔ یہ وُہ زمانہ تھا کہ تیرے سیمابی زنخدان پر سیاہی اپنا رنگ جما چکی تھی۔ تیری یہ مونچھیں جو اندنوں بالکل سفید ہو رہی ہیں۔ اُسوقت بنگالی کوّے کے پروں کی طرح سیاہ تھیں۔ اب تو تیرے رخساروں پر جھُرّیاں پڑگئی ہیں۔ اور انکی رنگت سیاہی مائل ہوگئی لیکن وُہ اسوقت بالکل سُرخ و سفید تھے اور تیرے دانت جو اب پُرانی دیوار کے بوسیدہ کنگروں کی طرح ایک ایک کر کے گر گئے ہیں۔ اسوقت ان میں موتیوں کی سی سفیدی تھی اور تیرے مسوڑوں میں اس طرح پیوست تھے۔ جیسے انگوٹھی میں نگینہ یا گوشت میں ناخن۔ تیرا قد جو اسوقت بارِ گناہ سے میوہ دار شاخ کی طرح زمین پر جُھک گیا ہے۔ اندنوں بالکل ایک سیدھے اور لمبے شہتیر کے مشابہ تھا۔ تیرے سر کے بال جنپر اب اوس پڑگئی ہے اور برف کی مانند سفید ہوگئے ہیں۔ اُسوقت بالکل کالا بھونرا تھے۔ دیکھ اے فنا کی دلیل۔ یہ

فرق تھا تیری جوانی کے مرقع اور بڑھاپے کی تصویر میں - اب تو کمزور بوڑھے کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے - اُن دنوں مضبوط نوجوان کے نام سے پکارا جاتا تھا - اے غافل شخص آ - ذرا تیرے بڑھاپے اور بچپن کی تصویر کا بھی فرق دکھا دوں یہ ہی تیری صورت جس پر اب مایوسی اور اُداسی برس رہی ہے - اسوقت اُس سے بھولی ادائیں آشکار تھیں - یہ تیرا چہرہ جس پر اب بیشمار کافور کے درخت کھڑے ہیں تب بالکل ارغوان زار تھا - تیری آواز جس سے ضعف مگر عیاری ٹپک رہی ہے - اسوقت بالکل سریلی تھی - تیری صورت سے فریفتگی اور بھولا پن ظاہر تھا اور تیری آنکھیں جواب جوانی کے غم میں بے نور اور خلوت نشین بنگئی ہیں - تب بالکل صاف اور چمکیلی تھیں - اب تو پیر سالخوردہ ہے تب طفل نوخیز تھا اب ایک ایسا کانٹا ہے جسکا زہر نیش عقرب ہے - اُسوقت ایسا پھول تھا جس کی مہک باغ میں اُڑ رہی تھی اب تو باپ بنگیا ہے اسوقت بیٹا کہلاتا تھا وہ صبح زندگانی تھی - یہ شام حیات ہے - وہ اقبال تھا - یہ زوال ہے - وہ آغاز تھا اور یہ انجام ہے - اُس وقت تو ایک مرغزار تھا جس کو سدابہار پھولوں کی خوشبو سے جنگل مہک اُٹھا تھا اور اب ایسی زمین ہے جسکے لمبے لمبے گھاس میں بیشمار زہریلے افعی رینگ رہے ہیں اور پھن کھولے کھڑے ہیں - کیوں اے نامراد شخص - ابھی تجھے کچھ فرق معلوم ہوا - ہاں ذرا اب تو اُن کرتوتوں کو سُن جنکا تو زمانہ شباب میں مرتکب ہوا - تجھے خدا نے آنکھیں دی تھیں کہ اُن سے اُس کے مناظر قدرت کو دیکھے اور اس کی صنعت کی داد دے لیکن تو ہمیشہ اس غایت کے برخلاف اُنسے کام لیتا رہا - تجھے کان دئے گئے تھے کہ نیک باتیں سنے - مگر بجائے اس کے تیں گوش پُر از زمزمہ چنگ و ربابست" کا مضمون تھا - تجھے ہاتھ دیئے گئے تھے مگر وہ خونریزی کے مشتاق ہو گئے تھے - تیری تلوار جسکا نام تونے "مرگ دشمن" رکھا تھا ہمیشہ خون سے رنگین نظر آتی تھی اور تیرے دامن و آستین پر اکثر خون کے چھینٹے نظر آتے تھے - جو ایک بجائے خود ایک خون ناحق

کی داستان کی سُرخی تھا۔ تو نے عورتوں کی عصمت دری کی۔ اُنکے پردہ ناموس میں رخنے ڈالے اُنہیں بے آبرو کیا۔ بچوں کو یتیم کیا۔ خاندانوں کو برباد کیا۔ دوستوں پر تہمتیں تراشیں بیسیوں رُوحوں کو خانمان آوارہ کیا۔ بہت سے سر تو نے کندھوں سے اتار دیئے۔ لوگوں پر جھوٹے الزام قائم کئے۔ امانتوں میں خیانت کی۔ دوسروں کے حصوں کو ہضم کر گیا اور ڈکار تک نہ لی۔ تو ہمیشہ اپنی مطلب براری کے لئے کمینے وسائل استعمال کرتا تھا فریب تو نے کئے۔ دغا تو نے کی۔ شاہی قانون تیرا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ انصاف کے رُو سے تو ہمیشہ پہلو بچاتا رہا اور جب کبھی قابو میں آیا تو زر پرست قانون دان جن کی علت غائی انصاف کا خون کرنا ہے تجھے اس کے عقوبت سے نجات دیتے رہے۔ یہ تیرے وہ مظالم ہیں جو تو نے اپنے ابنائے نوع کے ساتھ کئے۔ خدا کے ساتھ بھی تیرا برتاو اسی طرح کا تھا۔ دین میں تو نے رخنے ڈالے مذہب کو تو نے خراب کیا نبیوں کے وجود سے تو انکاری ہوا۔ کُتب سماوی اور اُن کی تنزیل میں تجھے کلام تھا اور پھر تیری آزادی یہاں تک پہنچی کہ خدا کی ذات سے بھی منکر ہو گیا۔ تُف ہے تیری اس زندگی پر۔ لعنت ہے تیری اس حیات پر۔ تیرے کاتبِ اعمال تیرا سیاہ نامہ لکھتے لکھتے تھک گئے مگر تو گناہوں کے ارتکاب سے ہرگز ہرگز نہیں تھکا۔ ؎

تھک گئے نامۂ اعمال کو لکھتے لکھتے ۔۔۔ کیا فرشتوں کا بُرا حال بشر کرتے ہیں

اب تیرا شباب گذر چکا تھا اور تو نے طوعاً و کرہاً زمانِ پیری کو آہ سرد کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ اس ناخوش آئند مہمان کی وقت میں تو کچھ اور ہو گیا۔ تیری حرارت برودت سے بدل گئی۔ تیرے بال سفید ہو گئے۔ پھر دانتوں نے رفاقت چھوڑی۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئیں۔ بدن میں خون نہیں رہا۔ کمر خم ہو گئی۔ اعضا سُست ہو گئے اور جسم میں لرزہ آ گیا۔ ان خوبیوں نے تیری صورت میں سنجیدگی پیدا کر دی اور تیرا چہرہ نورانی معلوم دینے لگا۔ ؎ شیخ زقبیلۂ معزز ۔۔۔ ریشے چو گلِ سفید یک گز۔

اور کون شخص تھا جو ایسی مرتاض اور پرہیزگار شکل والے شخص کے دھوکہ میں نہ آتا۔ جس کی لمبی گز بھر ڈاڑھی ہو اور ایک مقدس زاہد عابد کا لباس پہنتا ہو اور زبان پر ہر وقت دُنیا کی بے ثباتی کا مضمون رکھتا ہو۔ لیکن تو اور تیرا دل خوب جانتے ہیں۔ جیسا تو تھا تیرے بالوں سے سیاہی چلی گئی تھی۔ لیکن قلب اُسی طرح سیاہ تھا ؎

ہوس از سرت یکسر مُو نرفت
سیاہی ز مُو رفت و از رُو نرفت

ارے او آقا کے سرکش غلام جس کی فرمانبرداری سے تو نے سرتابی کی جس کی حلقہ بگوشی سے تجھے ہمیشہ انکار رہا۔ اور جس کی اطاعت کے لئے تو نے کبھی اپنے مغرور سر کو نہیں جھکایا۔ ذرا اپنی حالت کو دیکھ اور اس پر غور کر گنہگاری تیری طبیعت ثانیہ بنگئی ہے تیرا جسم خطا کاری کا پیکر بنگیا ہے اور تو جرائم کی زندہ مثال ہے۔ تو اللہ کے گھر سے بالکل پاک اور معصوم آیا تھا اور اب اُس کی خدمت میں مظالم اور معصیت کی پوٹ لیکر جائیگا۔ سوچ۔ اور ظالم سوچ تو کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ تو نے تمام عمر گناہوں میں بسر کی اور اب بھی اسی راستہ پر چل رہا ہے۔ ہائے تو بوڑھا ہوگیا مگر نیکی کا کبھی تجھے خیال تک نہیں آیا۔ اب تو مرنیوالا ہے لیکن انجام کا کچھ اندیشہ نہیں۔ ؎

تن میں رعشہ پڑ گیا پیری سے گردن جھک گئی
اب تو جھک سجدے میں اور سرکش خدا کے سامنے

اَے ظالم! اے سیاہ کار۔ اپنی حالت زار پر رو۔ ایام رفتہ پر ہاتھ مل۔ گذشتہ عمر پر جو برباد ہوگئی ہے اور نہیں لوٹیگی۔ افسوس کر۔ مگر اَے نادان اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ دن گذر گئے ہیں اور کبھی نہیں آئینگے۔ وہ بہاریں اب تجھے خواب میں بھی نصیب نہ ہونگی۔ وہ چاندنی راتیں واپس نہیں آئینگی۔ آہ تو کیا یہ امید کر رہا ہے کہ تیرا وہ زمانہ لوٹ آئیگا۔ جہاں تیرے مرنے والے باپ نے کھڑا کیا تھا۔ اور یہ ناممکن ہے

تو رائیڈن ان لوگوں کو جنہوں نے زندگی کے دروازہ میں تیرے ساتھ یا تیرے بعد قدم رکھا تھا۔ اس جہان سے کوچ کرتا ہوا دیکھتا ہے۔ مگر اُن میں کوئی بھی ایسا بدقسمت نظر نہیں آتا جیسا تو ہے۔ ان میں ایک بھی ایسی مایوس اور غمگین صورت نہیں جو تیرے ہم مشرب بن سکے تو ایامِ طفلی کو یاد کر رہا ہے اور رو رہا ہے۔ لیکن وہ وقت چلا گیا جب تجھے رونا چاہیے تھا اب تیری حسرت بیسود ہے۔ تیری ندامت بیفائدہ ہے۔ وُہ سُہانی چاندنی راتیں چلی گئی ہیں اور وُہ بہار کی فصلیں گذر گئیں۔

اے حسرت نصیب غم اندوز شخص۔ اب تیرا وُہ آخری دن ہی جس کے بعد تو دنیا کے روشن آفتاب کو قیامت تک نہیں دیکھ سکیگا۔ اُس کے مرغانِ سحر کی دلفریب زمزمہ پیرائی پھر نہیں سُن سکیگا۔ اور تو اپنے اہل وعیال کو اسی طرح چھوڑ جاویگا۔ جس طرح تجھے تیرا باپ تنہا چھوڑ جاویگا۔ اے خدا کے گنہگار بندے اسوقت ہزاروں آفتیں ہیں۔ جو تیرے مجروح دل کو ستا رہی ہیں۔ کبھی اس بھولی ہوئی اور مدت سے بچھڑی ہوئی ماں کی دھندلی تصویر تیری نگاہوں میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ جس کے مُرجھائے ہوئے چہرہ سے سرزنش کے آثار ظاہر ہیں۔ جو تجھے ملامت کرنے کے لئے لب کھولا چاہتی ہی۔ ادھر بوڑھے باپ کا خیال آتا ہے جس کے پاس تو آسمان پر جا رہا ہے۔ آج تجھے اُس کی فراموش شدہ وصیتیں یاد آ رہی ہیں جنپر تو نے عمل نہیں کیا۔ اور جب تو اس سے ملیگا تو وُہ غصہ کے ساتھ تیری طرف سے منہہ پھیر لیگا۔ اُس کی وُہ نگاہیں جو تیرے چہرہ پر پڑینگی۔ غضب آلود ہونگی۔ وہاں تُو کی بچھڑی ہوئی ماں بھی ملیگی۔ لیکن افسردہ خاطری کے ساتھ تیرا استقبال کریگی۔ ہائے تو اسوقت کیسا پشیمان ہی۔ اُن نیکیوں کے نہ کرنے سے جو تیرے امکان میں تھیں۔ اب تجھے وُہ خطائیں یاد آ رہی ہیں جو تو نے اپنی عمر کے حصہ میں کیں۔ وہ ناقابل معافی جرائم یاد آ رہی ہیں۔ جنکا تو راہِ حیات میں مرتکب ہوا۔ اے گمراہ شخص اب تو بسترِ مرگ پر پڑا ہے اور تجھ پر جان کندنی کی حالت طاری ہو گئی ہی۔ پیغامِ اجل آپہنچا ہی اور ملک الموت نے تیرا سر آغوش

میں لے لیا ہے اور یہ تیرا آخری منٹ ہے۔ جس میں تو چند سانس لے سکتا ہے۔ ہائے اسوقت تو کسقدر بیتاب ہے اور کتنا بیچین ہے اور افسوس کہ اِس حسرت اور غم میں وُہ سانس بھی ضائع ہو گئے۔ اب ایک سانس باقی ہے اور صرف ایک سانس۔ اَے قابلِ رحم غافل بوڑھے ابھی تیرے لئے وقت ہے۔ ابھی امید ہے۔ اُٹھ اور اُس پاک خدا کی درگاہ میں گردنِ نیاز جُھکا دے۔ اُٹھ اور اُس بے نیاز سے معافی مانگ۔ دو آنسو اپنی شرمسار آنکھوں سے نکال اور اپنے گناہوں کے دفتر کو دھو ڈال۔ اَے شرمسار بندے تجھے مُبارک ہو کہ تو بچگیا ہے۔ عذاب کے فرشتوں اور دوزخ کی دھکتی ہوئی آگ سے بہت دُور نکل گیا ہے۔ تجھے خوشخبری ہو کہ تو معاف کر دیا گیا ہے اور تجھے بشارت ہو کہ تو آزاد ہے۔ بہشت اور اس کی حوریں تیرا انتظار کر رہی ہیں۔ اب تو آرام سے جان دے اور یہ شعر پڑھتا ہوا چلا جا۔

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرقِ گناہست میرود بہ بہشت

ح - م - شیرانی - ٹونکی - منشی فاضل

کہوں کس سے قصۂ دردِ غم۔ کوئی ہمنشیں ہے نہ یار ہے
جو انیس ہے تری یاد ہے جو شفیق ہے دلِ زار ہے

تو ہزار کرتا لگاوٹیں میں کبھی نہ آتا فریب میں
مجھے پہلے اسکی خبر نہ تھی ترا وہی رنگ پیار ہے

یہ نوید اوروں کا جاسنا ہم اسیرِ دام ہیں اِی صبا
ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر ہمیں کیا جو فصلِ بہار ہے

مجھے رحم آتا ہے دیکھکر ترا حال اکبر نوحہ گر
تجھے وُہ بھی چاہے خدا کرے کہ تو جسکا عاشقِ زار ہے

(نجم الدین احمد)

(مولوی اکبر حسین خان بہادر سشن جج)

حُکّام کی تقلید

ہندوستان کا روز بروز۔ مغربی طرزِ معاشرت کی طرف غیر معمولی رجحان دیکھ کر بعض قدرتًا بے چین دلوں میں بے اختیار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک دن ہندوستان بھی اور ممالک کی طرح اہل یوُرپ کا مقلّد ہوکر "کالا یوُرپ" بنجائیگا؟ ساتھ ہی دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو کن اسباب سے ہوگا۔ پہلے سوال کا جواب اکثر موقعوں پر اثبات میں دیا گیا ہے اور دُوسرے سوال کے جواب میں عام طور پر اَلنّاسُ علےٰ دین مُلوکھِم کا زبردست قانون پیش کیا جاتا ہے یعنے انسان میں حکّامِ وقت کی تقلید طبعی طور پر پائی جاتی ہے اور جو رنگ حکّام میں مقبول ہو وُہ مقبولِ عام ہو جاتا ہے۔ مجھ کو اس موقعہ پر پہلے سوال کے جواب سے بالکل بحث نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں دخل دینا ایک دریائے بے پایان میں غوطہ مارنا ہے گو فی الحال مَیں دُوسرے سوال کے جواب کو لیتا ہوُں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے حکمران قوم کی تقلید کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ حکمران قوم اس ہماری تقلید سے بجائے خوش ہونے کے ناراض ہوتی ہے اور بجائے اس کی ترغیب دینے کے بعض اوقات اس پر تادیب کرتی ہے تو ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ پھر کس طرح سے اوّل الذکر قانون اہل ہندوستان کے اس رجحان پر عاید ہو سکتا ہے؟

بعض ملکوں میں البتّہ ایسا ہوا ہے کہ بادشاہِ وقت نے زبردستی رعایا کو اپنی خواہش کے موافق کسی خاص طرزِ معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ چنانچہ رُوس کے مشہور عادل بادشاہ پیٹر اعظم نے نہ صرف اپنی رعایا پر ڈاڑھی رکھنے کا ٹکس لگایا بلکہ ڈھیلے ڈھیلے

ایشیائی چوغوں کے بجائے یورپ کے چست لباس کو لباسِ عدالت کر کے نہایت سختی سے ملک میں مروج کیا۔ یہ اُسی مدبّر اور دُور اندیش بادشاہ کی بدولت ہو کہ آج یورپین رُوس کم از کم طرزِ معاشرت میں اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب یافتہ قوموں کا ہم پلّہ ہے۔ بعض اور ملکوں میں کسی زمانہ میں شاید ایسا ہوا ہو کہ بادشاہ وقت نے اپنی مرضی کے موافق رعایا کی طرزِ معاشرت کو تبدیل کر دیا ہو مگر موجودہ ہندوستان میں اس طرح کا کوئی جبر موجودہ منصف مزاج حکمران قوم سے عمل میں نہیں آیا۔ پھر کیوں دن بدن ہم ہر ایک مشرقی چیز سے نفرت کرتے جاتے ہیں؟ اگر محض یورپ کی تقلید ہی اس عظیم انقلابِ تہذیب کی بانی ہے تو البتہ یہ امر ایک درجہ افسوسناک ہو۔ لیکن اگر کوئی اور نامعلوم مگر زبردست قانون اپنا اثر ڈال رہا ہے۔ اور قانونِ قدرت کی طرح معیشت کو نیچے کی سطح سے اُوپر کی سطح پر لاتیکائل کر رہا ہو تو ہم کو بجائے بحر تفکر میں غوطہ لگانے کے خوش کن خوابوں میں محو ہونا چاہیے

اس مسئلہ کے معلوم کرنے کے لئے اگر ہم تاریخ سے مدد لیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ ہم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں۔ اُنکا حال پڑھنے سے اور اُنکے تبدل معیشت کے اسباب پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ وُہ کونسا زبردست قانون ہو کہ جو ایک قوم کو بلا لحاظ ملت و مذہب دُوسری قوم کی طرز معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ گال کی نیم وحشی قوم نے قدیم روما کی مشہور و مستند مہذّب قوم کو میدانِ جنگ میں شکست دی۔ پھر قدیم روما نے یُونان کو جہاں کا فلسفہ اور لٹریچر دُور دُور مشہور تھا اپنے زیر فرمان کر لیا۔ تو کیا قدیم روما کی مستند تہذیب بھی قوم گال کی وحشت کے تابع ہو گئی؟ کیا یُونان کا فلسفہ اور علم ادب قدیم روما کے قانون کے آگے معدُوم ہو گیا؟ اگر ایسا نہیں ہوا تو گویا فاتح کا اثر مفتوح پر صرف ملک ستانی ہی تک رہا اور النّاس علےٰ دینِ ملوکِھم کا قانون ٹوٹ گیا۔ اور واقعی ایسا نہیں ہوا قوم گال کو اہل روما کی تہذیب ماننی پڑی اور اہل روما کو یونانی فلاسفروں اور ادیبوں کا شاگرد ہونا پڑا۔

اسی طرح سے مشرقی دُنیا میں عبّاسی خلافت کے نام و نشان مٹانے والے ہلاکو خاں کی اولاد کو ایک دن ایسا آیا کہ عرب کی تہذیب اور مذہب سے فائدہ اُٹھانا پڑا اور جو خونخوار تُرک عرب کی ہر ایک چیز کو مٹانے کے پیچھے پڑا تھا آخر شُد وہی اُنکے نقشِ پا کی طرح اُن کی یادگار رہگیا۔ مغلوں نے ہندوستان میں آکر اعلیٰ طبقہ میں ایران کی تہذیب جاری دیکھی۔ خود بھی اُسی کے مرید ہوگئے فاتح مفتوح کا خیال دِل سے مفقود ہوگیا اور وہ دِن آیا کہ جو کتاب بابر نے اپنی مادری زبان میں لکھی تھی (یعنی ترکی میں) وہ اس کے پوتوں کے لئے ایک غیر زبان میں ہوگئی۔

دُور کیوں جائیں۔ ہندوستان کی تاریخ ہی ملاحظہ کیجئے۔ آریا آئے قدیمی باشندوں کو مار بھگایا۔ اُنسے زبردست تہذیب والی قوم اُنپر حملہ آور ہوئی اُس نے اپنا سکّہ جمایا۔ یُونہی ایک تہذیب سے مقابلہ ہوتا رہا۔ حتّٰی کہ اب مشرقی تہذیب کا مغربی تہذیب سے معاملہ آن پڑا اور چونکہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ ہندوستان مغرب کی تہذیب کی طرف نہایت تیزی سے چلا جارہا ہے۔ اِس مسئلہ کے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہی کہ مغربی تہذیب مشرقی تہذیب سے زیادہ زبردست ہی۔ کیونکہ جس قدر تاریخی واقعات اُوپر بیان کئے جاچکے ہیں۔ اُن سے صریح طور پر ظاہر ہورہا ہے کہ جب کبھی دو تہذیبوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہمیشہ اعلیٰ طبقہ کی تہذیب ادنیٰ طبقہ کی تہذیب پر غالب آجاتی ہے۔

اِسی سلسلہ میں ایک اور امر قابلِ غور ہے۔ کیا وجہ ہے کہ مغربی طرزِ معاشرت زیادہ تر اُن ممالک ہندوستان میں جلد مقبول ہوئی اور ہوتی جارہی ہے جو اصلی ہندوستانی تہذیب کے دائرہ سے دُور تھے۔ مثلاً بمبئی کلکتہ مدراس۔ پنجاب وغیرہ۔ عام طور پر اس کا جواب یہی ہوگا کہ چونکہ ہندوستان میں اوّل اہل یورپ کا قدم بمبئی۔ کلکتہ۔ مدراس میں آیا تھا اس وجہ سے اُنکی تہذیب بھی وہیں زیادہ پھیلی۔ مگر اصل وجہ یہ نہیں ہی۔ اصل وجہ یہ ہے

کہ ان ممالک کی کوئی مستند تہذیب نہ تھی جو تہذیب انکو ملی اس کو انہوں نے فوراً منظور کرلیا - برخلاف اس کے ہندوستان اپنے زمانہ میں تہذیب کا منبع تھا - اسی لیئے دہلی اور لکھنؤ اور ان کے نواح آجتک ہر ایک مغربی چیز کی خوبی قبول کرنے میں حیلہ و حجت کئے بغیر نہ رہینگے - کیونکہ ان کی بھی برسوں کی محنت کی کمائی انکی تہذیب ہی تھی - اب اسکو بھی یہ مغرب کے حملہ آور اور شرقی یادگاروں کے ساتھ پاؤں تلے روند ڈالیں - تو کیوں نہ اُس تہذیب کے فدائی زبانِ حال سے یہ شعر پڑھیں ؎

کن محنتوں سے ہائے بنا تھا یہ قصرِ دل
قسمت میں تھا مری کہ اسے برباد دیکھنا

مگر دنیا کا یہی دستور ہے اور خواہ اسے جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کی دنیا کہیے - مگر قانونِ قدرت یونہی ہے کہ ہر ایک کمزور شے کو اُس سے زیادہ طاقتور شے اُس کی جگہ سے ہٹا کر اپنا قبضہ کرلیتی ہے - ہر سیر کو سوا سیر اور ہر فرعونے را موسٰے - اسی طرح انتظامِ دنیا چلتا ہے - ہندی تمدن عرب کے تمدن کا مقابلہ نہ کرسکا اور اُس کے رنگ سے بہت کچھ رنگا گیا - گو بالکل مغلوب نہیں ہوا - اب جو قوم ہمپر حکمراں ہے اُس کا طرز معاشرت ہمارے طرز معاشرت سے کہیں اعلیٰ درجہ کا ہے اور جو کچھ اس کا اثر ہم پر پڑ رہا ہے وہ اظہر من الشمس ہے - مگر پھر یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ یہ اثر اس وجہ سے نہیں کہ وہ حکمران قوم ہے - بلکہ محض اس وجہ سے کہ مغرب مشرق سے بڑھا ہوا ہے - (کیا گردشِ زمانہ ہے) مصر و رُوم و جاپان کی طرز معاشرت کو دیکھکر اس کا علانیہ ثبوت ملتا ہے - یہ خود مختار سلطنتیں ہیں اور انپر کسی طرح کا حاکمانہ اثر مغربی طرزِ معاشرت کا نہیں پڑ سکتا - اور تو اور "دولت خداداد" افغانستان پر بھی جو اِس قدر امن سے بسم اللہ کے گنبد میں مغربی تہذیب کے اثرات سے محفوظ معلوم ہوتی تھی - یہ عالمگیر اثر اپنا جادو چلا گیا - جس سے یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچگیا کہ الناسُ علےٰ دینِ

ملوکھ کی مشہور ضرب المثل بھی زمانہ کی اور پرانی چیزوں کی طرح مستعمل ہوتے ہوتے بیکار ہوگئی ہے۔ پس یہ شکایت کرنی کہ یہ انقلاب کیوں ہو رہا ہے۔ ایک طرح سے قانونِ قدرت پر اعتراض اور اس بن مانگی خدا کے دین کا کفران ہے۔ ہمارے خیال میں یہ جو کچھ بھی رجحان مغربی طرز معاشرت کی طرف ہو رہا ہے۔ تقاضائے وقت ہے اور بہت خوب ہو رہا ہے۔ اور خوش نصیب ہیں وہ ملک اور وہ قومیں جنکو یہ ضرورت جلد تر محسوس ہو گئی +

مشتاق احمد زاہدی

ایک بچہ کی لوحِ تربت

یہیں پڑا ہے ہمارا غنچہ - نہیں جو پایا تھا مسکرانے
گرایا ٹہنی سے دیکے جھٹکا - ستم کیا اک دمِ صبا نے

وہ روح تھی تو نے پاک پائی - کرن کی صورت جہاں میں آئی
جھلک تھی اک نور کی دکھائی - گئی مگر پھر کدھر وہ جانے!

لئے نہ گنتی کے سانس تو نے کہ توڑ دی دل میں پھانس تو نے
مٹائی جینے کی آس تو نے - کہ دم لگا تیرا رک رک آنے!

چراغ میں جیسے تیل ہو کم - گئی ضیا تیری پڑتی مدھم
ہوا نگاہوں میں تیرہ عالم - کہ گل ہوئی شمع دودمانے

وہ اپنی اماں کے دل کا پارہ - وہ بابا کی پتلیوں کا تارہ
جہاں سے کر گیا کنارہ - لحد میں جا کر لگا ٹھکانے

ہوا تو آزادِ رنجِ دنیا - گیا تو بے لوث گنجِ دنیا
کہ ہے سرائے سہ پنج دنیا - گذشتنی رفتنی مکانے

جگر ہے گو غم سے پارہ پارہ - نہیں ہے صادق قضا سے چارہ
کہ تھا نہ ممتا نہ کچھ ہمارا - دیا خدا نے لیا خدا نے

سالگرۂ مُبارک حضورِ نظامِ دکّن

(از خیالاتِ تازۂ حضرت شہباز)

کیا صُبح ہے کہ شکل مجسم ہے نُور کی ! کیا شام ہے کہ زلف بکھرتی ہے حور کی !
کیا کیا نسیم چلتی ہے عیش و سرور کی ! اَے مرحبا ! یہ زمزمہ سنجی طیور کی
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

ہر باغ میں ہیں بُلبل و طوطی کے چہچہے ہر بزم میں ہیں مے کے صُراحی کے قہقہے
بھرتے ہیں جام سیل ہیں مے کے بہے بہے کیوں جوشِ سرخوشی میں نہ ہر رند یوں کہے
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

جس دِل کو دیکھو اُس میں خوشی ہے اُبل رہی ہے ناز سے نسیم گلستاں میں چل رہی
آفت بلا کی طرح ہے ہر سر سے ٹل رہی پتھر کے دِل سے بھی یہ صدا ہے نکل رہی
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

اِس دن نے کر دیا ہے زمانے کا غم غلط رہنا حزیں ہے آج خدا کی قسم غلط
ہے غم غلط زیادہ وُہ ہو یا کہ کم غلط کہتی خوشی ہے غم سے۔ نہ تھا غم ہے غم غلط
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

شاخوں پہ بُلبلیں ہیں چمن میں چہک رہی پھولوں کی بدھیاں ہیں گلوں میں مہک رہی
فوجیں شرابیوں کی ہیں پی کر بہک رہی کلیاں کہ تھیں خموش ہیں وہ بھی چہک رہی،
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

جتنے ٹھکانے ملک میں ہیں کارزار کے ہیں وردیوں سے فوج پہ عالم بہار کے
ڈالے گی جب یہ دھوم سلامی اُتار کے بندوق بھی کہے گی یہ سب سے پکار کے۔

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

قبضے میں اپنے کشورِ عیش و سرور کر
زخموں سے دم میں سینۂ اعدا کو چور کر
ہاں ہاں عیاں نیام سے اک شمعِ طور کر
تلوار رنگ غم کو ابھی دل سے دور کر
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

کاغذ کے صفحے پر جو ہے بڑھ کر حریر سے
رنگیں ہر ایک حرف ہے جس کا صفیر سے
زیر و زبر ہے جس کا بڑھا بم سے زیر سے
ہر لحظہ ہے عیاں یہ قلم کی صریر سے
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

ناحق تو اپنے دل میں نہ رہ اس طرح اداس
اے چرخ اُتار پھینک تو یہ نیلگوں لباس
مطرب کو رعد کے تو بُلا جلد اپنے پاس
ساقی سے ابر کے تو منگا بھر کے اک گلاس
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

کیوں اُڑ رہی ہیں مُنہ پہ تیرے یوں ہوائیاں
چہرے سے اپنے دُور کر اے چاند چھائیاں
آنکھوں میں پھیر نور کی اپنی سلائیاں
پھیلا کے چاندنی کی جہاں میں صفائیاں
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

قوسِ قزح کی یوں نہ غضب سے کماں چڑھا
بدلے تو آستیں کے نہ یوں ندیاں چڑھا
عشرت کی مے سے بھر کے کوئی جام ہاں چڑھا
اے ابر اس طرح سے نہ تو تیوریاں چڑھا
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

سورج دکھا خوشی کی ادا اپنی چال سے
لا ندیاں تو نور کی دشت و جبال سے
اس دم کا منتظر تھا جہاں ایک سال سے
نصف النہارِ عیش ہے مت ڈر زوال سے
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

طوفان! اپنے یوں تو پریشاں نہ بال کر
غصّے سے اور غضب سے بُرا یوں نہ حال کر
بادِ صبا کی طرح قدم رکھ سنبھال کر
نرگس کی طرح دل کو کھلا دیکھ بھال کر

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

ہاں اے دوات جلد سیاہی سے دُور ہو ہیں کشتیاں قصور - تو جلد ان میں حور ہو
الماس ہو عقیق ہو چاہے بلور ہو پی کر شرابِ لعل نشے میں تو چور ہو

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

سُرخی کی ہو دوات ترا جام اور سبو مستوں کی طرح جوش سے کر خوب گفتگو
سجدے کے بدلے جھوم کے مے پی، نہ کر وضو لکھ کر یہ خمسہ تو بھی ہو۔ اے خامہ سُرخ رُو

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

جھگڑے میں کیوں پڑے ہو فراموش یاد کو؟ دیکھو تماشے بیٹھ کے دلہائے شاد کے
لوٹو مزے فزکس[۱] کی جا ابر و باد کے لڑکو ڈرو نہ جور سے تم اوستاد کے

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

وُہ دل کہ دامِ رنج میں تھے کل تلک پھنسے مہمان اُنہی میں آج خوشی کے ہیں آ بسے
اُستاد بھی ہیں لہو و لعب پر کمر کسے چھٹی ملی۔ ہیں بند سب اسکول مدرسے

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

شہباز کی ہے فکر نہ بیٹھ اس طرح ملول لازم ہے باغِ عیش میں تیرا بھی ہو شمول
بلبل کی طرح جلد خوشی میں تو آ کے پھول ہنس ہنس کے کہہ رہی ہیں تجھی سے تو سب یہ پھول

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

---

[۱] علم طبعیات - یہی مضمون ہے جو پروفیسر آزاد اورنگ آباد کالج میں پڑھاتے ہیں۔ ایڈیٹر

مذہب اور سائنس

منشی سراج الدین احمد صاحب گورنمنٹ پنشنر جن کی ایک بسیط نظم اس سے پہلے درج ہو چکی ہے۔ اور جسے اکثر اہل دل اور سخن فہم حضرات نے نگاہ قبولیت سے دیکھا ہے۔ مذہب اور سائینس کا مندرجہ ذیل مناظرہ ارسال فرماتے ہیں۔ جسے ہم شکریہ کے ساتھ زینتِ اوراقِ مخزن بناتے ہیں :۔

ایک دن سائینس نے مذہب سے کی یُوں گفتگو
سچ بتا آیا ہے اس دُنیا میں کس مطلب سے تو

تجھ میں مَیں پاتا نہیں معقولیت کا نام تک
وہم و مظنونہ ہے تو آغاز سے انجام تک

وُہ بڑی ہستی مفروضہ جو ہے تیرا خُدا
آج تک اُس کا لگا یا کچھ نہیں تو نے پتا

گاہ تو نے اُس کا بتلایا اولمپس[1] پر مقر
تھا بلندی ہمالہ سے تو ناواقف مگر

گاہ سنگیں بُت میں تو نے اُس کا بتلایا ظہور
اور کہا گاہے جوالا مکھی[2] کو تو نے شمعِ طُور

گاہ تو[3] نے رُوح اور مادہ کو بتلا کر قدیم
خلقِ عالم میں بنایا آپ نے خالق کا ندیم

گاہ تو آتش کدے میں اُسکا دیتا ہے نشاں
آب و خاک و باد میں شاید نہ تھا کوئی مکاں

گاہ تو نے اُس کو نورِ وادیِ ایمن کہا
وُہ بھی پر میں ہُوں[4] جو ہوں سی کچھ نہ آگے کہہ سکا

گاہ تو نے اُس کو پہنایا مسیحا کا لباس
جو ہوا آخر کو قربانِ صلیبِ رنج و یاس

گاہ کیا ایجاد تو نے مسئلہ تثلیث کا
تین میں ایک ایک میں پھر تین تھے تیرے خدا

جب تیری کاریگری کوئی نہ نکلی کارگر
تو نے پھر پیدا کیا اپنے میں اِک خیر البشر

اُس نے بتلایا کہ وُہ ہستی ہے واحد بے بدل
جس نے سب پیدا کئے عالم میں اکثر اور اقل

ابتدا اُس کی نہ کوئی ہے نہ کوئی انتہا
جسم ظاہر سے بری بالاتر از فہم و ذکا

[1] یونان میں ایک پہاڑ ہے جسکو یونانی خدا کا تختگاہ خیال کرتے تھے۔ [2] کانگڑہ میں جوالا مکھی کوہ آتش فشاں ہے جسے ہندو جوالا کی جگہ بتلاتے ہیں۔ [3] ارسطو کا اصول۔ [4] توریت کتاب خروج باب سوم آیت ۱۴

لامکاں اُس کا مکاں ہی لازماں اُس کا زماں
کنہ پر حاوی نہیں ہیں اس کے جب کب اور کہاں

سچ بتا مجھ کو کہ تو سمجھا ہی اس نکتہ سے کیا
کیوں نہ اُقلیدس کا نقطہ تو نے اُس کو کہدیا

وہ کتابیں جنکو بتلاتا ہے تو حق کا کلام
تیری معلومات کی خوبی پہ شاہد ہیں تمام

خلق موجودات کی ترتیب ہے جو واں بیاں
اس سے ای ناداں تیری تکذیب ہی خود ہی عیاں

تین دن[1] میں عرش و فرش و صبح و شام و بحر و بر
سب کے سب بنکر زمیں میں سے اُگے نخل و ثمر

پر عجب تر یہ کہ چوتھے دن[2] بنے شمس و قمر
تا جماویں سلطنت اپنی وہ دن اور رات پر

ان کتابوں کے مصنف کو اگر ہوتا پتا
شمس ہی مرکز ہے دورِ عالمِ دوّار کا

گر زمیں کی ہر دو حرکت کی اُسے ہوتی خبر
جس سے ہوتے ہیں ہویدا موسمِ شام و سحر

واقفی ہوتی جو تاثیراتِ شمسی سے اُسے
ابخرے جن سے اُٹھے بادل بنے پودے اُگے

الغرض گر جانتا اسرارِ خلاقِ کبیر
تب وہ یوں کہتا کہ پہلے دن بنا مہرِ منیر

نوح کے طوفاں[3] سے کی غرقاب تو نے سب زمیں
پر نہ شامل تھے[4] تیرے جغرافیہ میں ہند و چیں

تو نے جو کشتی بنائی بہرِ نوحِ حق شناس
تین سو ہاتھ[5] اُسکی لمبائی تھی چوڑائی پچاس

یہ نرالے ڈھب کا گھر تھا گرچہ تنگ اور مختصر
پر بنا وہ تیری خوش فہمی سے زنبیلِ عمر

جس[6] میں کل روئے زمیں کے جملہ حیوانات کا
زادِ شش ماہہ سمیت ایک ایک جوڑا آگیا

تو نے بخشے تھے جسے احیاءِ موتے کے قوا
خود اُسی[7] کو تین دن تک قبر میں مردہ رکھا

آسمانوں کی حقیقت سے اگر ہوتی خبر
تو نہ جسمِ عنصری کو بھیجتا افلاک پر

گر سنے تجھ سے حکایت سیرِ ذوالقرنین کی
اور روایت تیرے مشرق اور مغرب کی کوئی

گرم چشمے میں سے خورشید کو گر ڈوبتا
فہم اور ادراک پر تیرے کہے سو مرحبا

[1] توریت کتاب پیدائش باب اول آیت اول تا ۱۳ - [2] توریت کتاب پیدائش باب اول آیت ۱۴ تا ۱۹ - [3] توریت کتاب پیدائش باب ششم آیت ۴ - [4] چین اور ہندوستان کے حکما طوفان کے قائل نہیں اور کہتے ہیں کہ انکے ہاں طوفان سے پہلے کی کتابیں اور نوشتے موجود ہیں - [5] توریت کتاب پیدائش باب ششم آیت ۱۴ - [6] توریت کتاب پیدائش باب ششم آیت ۱۹ - [7] حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ ہی جنکی نسبت روایت ہی کہ تین دن تک قبر میں رہے پھر زندہ ہو کر مع جسم آسمان پر چلے گئے ۱۲

یہ نمونے تیری معلومات کے بالاختصار — کشتے از خروار ہیں اور اند کے از صد ہزار
تیری کرتوتوں کا اک شمہ اگر کیجے بیاں — سیکڑوں دریائے خوں چشمِ بیاں سے ہوں رواں
تو نے ہی سقراطِ ایتھنزی[سلہ] کو بے جرم و خطا — دیکے حکمِ موت پلوایا پیالہ زہر کا
غار میں شیروں کے وہ مظلوم و بیکس دانیال — کر رہا ہے تیرے ہی ظلم و ستم کی قیل و قال
ہاں بگاڑا تھا تیرا بیچارے ذکریا نے کیا — جسکو ہاتھوں نے تیرے آرے سے دو ٹکڑے کیا
کر رہا ہے طشت میں اس بیگنہ بچے کا سر — راز طشت از بام خونریزی کا تیری سر بسر
ابن مریم کے لئے تو نے دیا حکمِ صلیب — تیرے نیزہ کا ہوا زخم اُسکے پہلو کو نصیب
تو ہی بتلا دے کہ جون آف آرک[سلہ] کا تھا کیا قصور — جسکو جیتے جی کیا تھا تو نے ہی نذرِ تنور
بھاگتا پھرتا ہے کیوں لوتھر مقدس کوبہ کو — گر تعاقب میں نہیں ہے اس کے اے سفاک تو
کس نے ابنِ آمنہ کے قتل پر باندھی کمر — کس نے بند ہوایا وطن سے آپ کا رختِ سفر
کس نے رکھی اس جہاں میں سالِ ہجری کی بنا — ہر محرم میں یہاں ہوتا ہے کیوں محشر بپا
جعفر و زنیرہ و عمار و خباب و بلال — کر رہے ہیں تیرے ہی ہاتھوں سے کا زحال احال
ہو رہے ہیں آج تک صدیق و فاروق و غنی — موردِ تشنیع کرتوتوں سے اے ظالم تری
شافعی کو دیکھ اور اس کے پاؤں کی زنجیر کو — بوحنیفہ کی دل آزاری کو اور تکفیر کو
بند حنبل جیلخانہ میں ہوا کس جرم پر — اور بخاری کو وطن سے کس نے کروایا بدر
ہاتھ مالک کا ہی یوں بازو سے کیوں اکھڑا ہوا — کس کے کوڑوں سے بہا ہے خون اُس کے جسم کا
صحنِ مسجد میں نسائی کو کیا کس نے شہید — خوار و رسوا کس نہ کروائے سعید و بایزید
کھال کیوں بوبکرِ نابلسی کی کھچوائی گئی — کیوں غزالی کی ہر اک تحریر جلوائی گئی
کون یورپ کو چڑھا لایا صلاح الدین[سلہ] پر — لشکرِ رچرڈ کو کس نے تھا کیا زیر و زبر

سلہ ایتھنز دار الخلافہ یونان کا باشندہ ۱۲ سلہ ایک مقدس عیسائی عورت ۱۲ سلہ عیسائیوں کے صلیبی جنگ کیطرف اشارہ ہے جس میں رچرڈ شیر دل عیسائی فوجونکا سپہ سالار ہوکر آیا تھا اور بڑی خونریزی اور قتل کے بعد نہایت ندامت سے واپس ہوا۔

ہسٹری اسپین[۱] کی کرتی ہے دل کو پاش پاش ۔ تھی جہاں صدیوں تلک اسلامیوں کی بود و باش

کر کے فرڈیننڈ کو آمادۂ ظلم و ستم ۔ تو نے ہی ایک ایک کے اخراج کی کھائی قسم

اِک کو مارا تو نے چھینی دوسرے کی جائداد ۔ موجِ دریا کو کسی کا شور و شین اب تک ہے یاد

اِن دنوں میں سید احمد خاں نے جب باندھی کمر ۔ قوم کی اصلاح پر اور خود تری بہبود پر

تو نے اُسکو سیکڑوں باتیں کہیں ناگفتنی ۔ تجھ سے ہی اُس نے خرافاتیں سُنیں ناشنیدنی

خون ہزاروں بیگناہوں کی ہیں گردن پر تری ۔ سینکڑوں سلجھاؤ قرباں ہیں اک اُلجھن پہ تری

اِس غضب کی تو نے بھڑکائی ہے سب قوموں میں آگ ۔ باپ سے بیٹا جُدا ہے ماں کو ہے بیٹے سے لاگ

کوئی زردشتی ہے کوئی بدھ موسائی کوئی ۔ کوئی ہندو ہے مسلماں کوئی عیسائی کوئی

شاذ و نادر اِن میں ہمدردی ہو گر باہم دگر ۔ آنکھ میں تیری تعصب سے لہو جاتا ہے بھر

علم سے نفرت ہے تجھ کو عقل کا دشمن ہے تو ۔ اتفاقوں کا مخالف مال کا رہزن ہے تو

گو بھلے مانس کمالوں کا ترے یہ حال ہے ۔ پر تری ابلہ فریبی کا بھی ایسا جال ہے

کوئی آنکھ ایسی نہیں ہے تجھ پہ جو شیدا نہ ہو ۔ کوئی دل ایسا نہیں ہے جس میں تو پیدا نہ ہو

تو نے دے رکھی کسیکو دید مولے کی نوید ۔ اور کسیکو راحتِ جاوید کی دی ہے اُمید

کوثر و تسنیم جنت کی کسی کو دی ہوس ۔ اور کسی کے سر میں وصلِ حور کا سودا ہے بس

پر جنابا یہ تو بتلا دے کہ یہ سب سبز باغ ۔ جس پہ تجھ کو اور ترے شیدائیوں کو ہے دماغ

کس طرف ہیں کس جگہ ہیں کیا ہیں اور کیسے ہیں وہ ۔ آسمانوں کی طرح ہیں یا زمیں جیسے ہیں وہ

میں تو ڈرتا ہوں کہ ہے جیسی تری ماضی و حال
تیرا استقبال بھی ہوویگا صرفِ انفعال

(باقی آئندہ)

سراج الدین احمد

۱؎ اسپین میں جسکو مسلمان اندلس کہتے ہیں۔ تقریباً سات سو برس تک مسلمانوں کی سلطنت رہی اور شاہ فرڈننڈ کے وقت یہ لوگ بہت بے رحمی کے ساتھ وہاں سے نکالے گئے ۔

بادل

میں بھی اے ابر ترے حسن کا شیدائی ہوں
تری نیرنگی کا دیرینہ تماشائی ہوں
میری[لہ] آنکھوں نے تجھے دیکھ کے وہ کچھ دیکھا
کہ زبانِ مژہ پر شکر ہے بینائی کا
اس قدر روپ انوکھے جو دکھائے تو نے
سچ بتا کس سے یہ انداز اڑائے تو نے
کبھی ہیبت بھری صورت تو بنا لاتا ہے
بن کے اک موہنی مورت تو کبھی آتا ہے
دل سے مجھ کو یہ تری عشوہ گری بھاتی ہے
یہ ادا تجھ کو اسی شوخ نے سکھلائی ہے

چاندنی رات میں وہ ناز سے آنا تیرا
بن کے اک نور کا پتلا وہ دکھانا تیرا
چاند کو پیار سے سینے سے لگانا تیرا
اور کبھی دور اسے چھوڑ کے جانا تیرا
چاند کے حسن پہ کیا دل ہے ترا آیا ہوا
ہالہ کہتے ہیں جسے یہ ترا آغوش ہی کیا؟
دل لگی چاند سے تیری یہ مجھے بھاتی ہے
گو مری یاد کو بے چین یہ کر جاتی ہے

لطف رکھتا ہے گرج کر یہ برسنا تیرا
ہے یہ انداز نمائے غضب و رحمِ خدا
چشمِ معنی کو بہت کچھ نظر آیا اس میں
کھچ گیا یسر مع العسر کا نقشہ اس میں

جبکہ جل جائے تمازت سے زمیں کا سینہ
حکمت آمیز ہے تھم تھم کے برسنا تیرا
پیاس کی آگ کو جس طرح بجھائے کوئی
جرعہ جرعہ کسی پیاسے کو پلائے کوئی

لہ شیخ ناسخ علیہ الرحمۃ کا شعر ایک لفظ بدل کر جڑ دیا گیا ہے ۱۲

جلوہ برق تری موجِ تبسّم تو نہ ہو؟ نعرہ رعد ترا شورِ ترنّم تو نہ ہو؟
ہائے البیلی یہ رفتار یہ بے ساختہ پن منعکس تیری ادا میں ہے حسینوں کا چلن
بے سبب کب یہ ترا جھوم کے یوں آنا ہے تو کسی ناز کے متوالے کا مستانہ ہے

تیرا اندازِ دلاویز جو اُس کو بھایا ہار گردن میں تری قوسِ قزح نے ڈالا
گل کھلاتی ہے تری آڑ میں سورج کی کرن کیسے رنگوں کے دکھاتی ہے دلاویز چمن
تیرے صدقے سے ہے گلکارِ شفق کی شہرت تیرے چہرے پہ دکھاتا ہے وہ اپنی صنعت
تیری مشاطہ ہیں دو نورِ سحر رنگِ شفق تو ہے آئینہ نیرنگیِ حسنِ مطلق
شاہدِ حسنِ ازل کا ہے تو برقعِ بیشک تجھ میں آتی ہے نظر اُس رخِ روشن کی جھلک

ڈال کر اپنے دلِ زار کی حالت پہ نظر رشک آتا ہے مجھے تیری سبک باری پر
مخمصوں سے نہ غرض تجھ کو نہ غم کی پروا کام تیرا ہے ہواؤں سے کلیلیں کرنا
دردِ پنہاں سے نہیں اشک بہانے تجھ کو وسوسے کا ہے کو آتے ہیں ستانے تجھ کو
پڑے پالا کبھی کیوں خوف و رجا سے تیرا! ہے اگر کام تو ہے صدق و صفا سے تیرا
کب تلک دیکھئے تجھ کو نگہِ حسرت سے کاش میں تجھ میں پہنچ جاؤں کسی صورت سے

کسی ترکیب سے دُنیا سے اُٹھا لے ابرِ
اپنے نیرنگ کو اپنے میں ملا لے ابرِ

نیرنگ

انتظارِ بہار

یہ نظم جاڑے کے موسم میں لکھی گئی ہے۔ اور اُس وقت کا نقشہ کھینچتی ہے۔ ایک عرصہ سے ہمارے پاس پہنچ چکی تھی۔ مگر چھپنے کی اب نوبت آئی ہے۔

(باپ بیٹے کی گفتگو کشمیر میں)

بیٹا۔ آج کل کچھ ہے طبیعت بے قرار — سختیٔ سرما سے ہے دل پر غبار
کانپتا ہے خود بخود جسمِ نزار — دانت بجتے رہتے ہیں لیل و نہار
کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ کس لئے ہوتے ہو بے چین اس قدر — بات یہ کیا ہے شکایت کی مگر
یہ بھی اِک موسم ہے اے جانِ پدر — جو گذر جائیگا اپنے وقت پر
صبر کر بیٹا۔ اب آتی ہے بہار

بیٹا۔ جمع ہر جانب گھٹا سے پر ہوئی — اور اِک دلدل زمیں یکسر ہوئی
برف عالم کے لئے چادر ہوئی — کٹھ کشو سے زندگی دوبھر ہوئی
کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ یہ نہیں برف اِک جہاں میں نور ہے — نور ہے یا بارشِ کافور ہے
بارشِ الماس اور بلور ہے — جلوہ برقِ جمالِ طور ہے
اِس کے پیچھے پیچھے آتی ہے بہار

بیٹا۔ باغ ہے مُردہ تو بے دل باغباں — پھول کیا عنقا ہے سبزی کا نشاں
جم کے پانی ہو گئے فولاد ساں — ہے زمیں چٹی تو بھورا آسماں
کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ برفِ تازہ سے لدے ہیں کوہسار — یا ہے چاندی کے پہاڑوں کی قطار
گلفشاں ہونے کو ہیں سب مرغزار — ہے زمستاں میں شگوفہ کی بہار

اب کوئی دن میں ہی آتی ہے بہار

بیٹا - گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرائے ہے   خود نکلتے ہیں ۔ نہ کوئی آئے ہے
نکلیں کیونکر تیغ تو کاٹے کھائے ہے   اور ہوا سے ناک کٹتی جائے ہے

کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ - ہیں لباسِ برف میں جلوہ کناں   کیا شجر کیا کوہ اور کیا وادیاں
فرش سے تا عرش سیمابی سماں   اِک عظیم الشان منظر ہے جہاں

دیکھ لو اِس کو پھر آتی ہے بہار

بیٹا - شکل سورج کی نظر آتی نہیں   دھوپ میرے دل کو گرماتی نہیں
بلبلیں بھی راگنی گاتی نہیں   ہائے یہ سردی کہیں جاتی نہیں

کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ - جانِ من وہ رب ہے رب العالمیں   تیری ہی اِک ننھی بستی کا نہیں
استوا کے پار ہے جو سرزمیں   آجکل سورج چمکتا ہے وہیں

اسکو گرما کر اب آتی ہے بہار

بیٹا - کوئی چنڈول ابر تک جاتا نہیں   کوہ۔کوئل کی صدا لاتا نہیں
کوئی کستورہ بھی تو گاتا نہیں   اور میرے دِل کو بہلاتا نہیں

کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ - جانتے بھی ہو کہ وہ پروردگار   نعمتیں دیتا ہے ہر دم بے شمار
اُس کے لطفِ عام سے ہر جاندار   ایک کھوتا ہے تو پاتا ہے ہزار

صبر کر بیٹا اب آتی ہے بہار

بیٹا - ہائے وہ فرشِ زمرد ہے کہاں   گھاس پر قالینِ مخمل کا سماں
جوئباروں پر چناری سائباں   وہ زمینِ سبز پر سبز آسماں

اب بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ - استوا کے پار ہیں جو بستیاں ہیں ہزاروں آدمی بستے وہاں
رکھتے ہیں جو ہمسا دل اور ہمسی جاں آج کل پھر اُنکا حق ہے بیگماں
اُنکو خوش کر کے اب آتی ہے بہار

بیٹا - ہائے اب وُہ چاندنی راتیں کہاں چاندنی کی سیر پانی کا سماں
موجِ سیمیں پر شعاعیں زرفشاں ہیں دلِ دریا میں گویا بجلیاں
اب بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ - خوب پائی ہے طبیعت اے پسر کیسی بھولی تیری باتیں ہیں مگر
موسمِ سرما بھی سچ پوچھو اگر ہے کرشمہ فیضِ حق کا سربسر
صبر کر بیٹا اب آتی ہے بہار

بیٹا - سبز کہساروں میں وُہ سبز آب دُل اُس کی سطحِ صاف پر لاکھوں کنول
آئینہ سے جیسے پھول آئیں نکل یاد جی کر کے جاتا ہے مچل
اب بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ - گر ہوائے دہر طوفانی نہ ہو اور سر کوہ برف افشانی نہ ہو
چشمہ دریا میں بھی پانی نہ ہو رُوئے کشتِ دُل بھی لاثانی نہ ہو
جاڑا آتا ہے تب آتی ہے بہار

بیٹا - گاہ یہ سردی گہے وُہ گرمیاں یاد جی کر کے ہوتا ہے تپاں
تھی خزانہ میں کمی کیا کچھ وہاں گر خدا رکھتا سدا یکساں سماں
کیوں ہمیں ترسا کے آتی ہے بہار

باپ - ایک ہی موسم اگر رہتا سدا قدر ہی ہوتی پھر اُس کی ہم کو کیا
جبکہ انساں فطرتاً ہیں سب جُدا ہے یہی نیرنگِ عالم میں مزا

نت نیا جوبن دکھاتی ہے بہار

بیٹا- ہم تو سمجھے تھے کہ مُلکِ کاشمیر
ہو گا سچ مچ خطۂ جنّت نظیر
پر نکل آیا وُہ پُورا زمہریر
ہائے! ہم سمجھے نہ لفظِ کاش میر
کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ- طعن اپنا شیوۂ ملّت نہیں
گر نہ ہو تکلیف تو راحت نہیں
اک زمانہ کی سدا حالت نہیں
حیف ہے گر دیدۂ عبرت نہیں
صبر کر بیٹا اب آتی ہے بہار

بیٹا- اپنی گستاخی سے ہُوں میں شرمسار
دل کچھ ایسا ہو گیا بے اختیار
ہاتھ سے جاتا رہا صبر و قرار
کچھ تو کہئے گا- یہ کب تک انتظار
اب بتا دیجئے کب آتی ہے بہار

باپ- بات یہ کیا ہے بتانے کی پسر
دھُوپ کی رنگت ہوا و نکا اثر
خود بخود بنکر روانِ ہر شجر
دیگا مرغوں کی زبانی یہ خبر
خوش ہوا اے لوگو- وُہ آتی ہو بہار

صادق علی خاں (از سرینگر)

ماتمِ پسر

ہمارے ایک عنایت فرما رئیس بارہ مولا علاقہ کشمیر خواجہ صمد جو صاحب گلّٹ ہیں- انہیں چند ماہ ہُوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی مرگ ناگہاں کا داغ دیکھنا نصیب ہوا- خواجہ صاحب ذی علم- علم دوست رئیس ہیں اور خود زبانِ فارسی میں طبع شاعر ہیں اور مقبل تخلص کرتے ہیں- مگر اس رنج نے انکی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے

اور انہیں تصویرِ غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے اُن کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو درج ذیل ہی:-

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا — وُہ خورشیدِ روشن نہاں ہو گیا
بیاباں ہماری سرا بن گئی — مسافر وطن کو رواں ہو گیا
گیا اُڑ کے وُہ بلبلِ خوش نوا — چمن پائمالِ خزاں ہو گیا
نہیں باغِ کشمیر میں وُہ بہار — نظر سے جو وُہ گل نہاں ہو گیا
گیا کارواں اور میں راہ میں — غبارِ رہِ کارواں ہو گیا
گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر — مرے صبر کا امتحاں ہو گیا
بڑھا اور اک دشمنِ جانستاں — دھواں آہ کا آسماں ہو گیا
ستم اِس غضب کا خزاں نے کیا — بیاباں مرا بوستاں ہو گیا
ہُوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے — کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا
کسی نوجواں کی جُدائی میں قد — جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا
جُدائی میں نالاں ہو بلبل کیوں — وُہ گل زیبِ باغِ جناں ہو گیا
وُہ سُرخی ہے اشکِ شفق رنگ میں — حریفِ مئے ارغواں ہو گیا
بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں — وُہی نذرِ برقِ طپاں ہو گیا
کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح — کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا
غضب ہے غلامِ حسن کا فراق — کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہو گیا

دیا چن کے وُہ غم فلک نے اُسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا

محمد اقبال

کچکول

واحد سے ہیں جمع کا طلبگار ہوا جو سرِّ عظیم تھا وہ اسرار ہوا
اک نور تھا اس میں جب ہوئی جمع صفت بڑھتے بڑھتے وہ نور انوار ہوا

(اشہری)

اللہ ہے نور اہرمن ظلمت ہے اک شمع ہے اک دھوئیں کی خاصیت ہے
ہم تم ہیں ضیائے شمعِ ذاتِ باری یہ شرحِ صفات و ذاتِ احدیت ہے

(〃)

مٹی کا کرہ بنانے والے ہم ہیں پانی اس پر بہانے والے ہم ہیں
پانی پہ ہوا ہوا پہ آتش دیکھو اضداد کو یوں ملانے والے ہم ہیں

(〃)

ہے آگ کو پانی میں بنایا ہم نے پانی کو ہوا میں ہے بچھایا ہم نے
پانی میں ہوا ہوا میں پانی دیکھو یہ معجزہ دنیا کو دکھایا ہم نے

(〃)

روٹھی ہوئی نگاہ نے تلواریں مار کے ٹکڑے اڑا دیئے دلِ امیدوار کے
وحشت سنبھل کہ ہم تو کہیں کے نہیں رہے مسکن کے ہیں پتے نہ ٹھکانے مزار کے
شعلہ کسی کی برقِ نظر کا تڑپ گیا روشن ہوئے چراغ دلِ داغدار کے
یہ چاہے جس طرف ہمیں لے جائے جائینگے ہیں اختیار میں دلِ بے اختیار کے
اب جی میں ہے کہ پھینکدیں پہلو سے چیر کر برسوں اٹھائے ناز دلِ بے قرار کے
جوبن پہ داغِ دل ہیں ذرا سیر تو کرو دیکھو تو ہم نے پھول چنے کس بہار کے

صیاد نے چمن کی ہوا تک نہ دی ہمیں آئے بھی اور چلے بھی گئے دن بہار کے
تن تن کے اس طرح سے تو انگڑائیاں نہ لے
شاعر نثار تیرے انوکھے خمار کے

(حضرت آغا شاعر دہلوی)

مسکن بھی کوئی قبر سے بہتر نہیں ملتا آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا
پھر دیکھ لوں اُن روٹھی نگاہوں کی میں قرباں اُٹھنا اُسی انداز سے کہہ کر نہیں ملتا
کیا اشک بھرے بیٹھی ہیں وہ بزم عدو میں نرگس کے کٹوروں میں یہ جوہر نہیں ملتا
اِس واسطے کہتے تھے ستانا نہیں اچھا شاعر کئی دن سے ترے در پہ نہیں ملتا

(۲)

کہاں گیا مرا گلرو ہزار کر کے مجھے خزاں رسیدۂ عینِ بہار کر کے مجھے
نہ جانے اُن کی نگہ نے کیا تھا کیا جادو وہ کھینچ لے گئے بے اختیار کر کے مجھے
کسی کا یاد ہے شوخی سے وہ چلا جانا جھلک دکھا کے مجھے بے قرار کر کے مجھے
الٰہی شکر! لگانے لگے جو مرہم لطف نگاہِ خشم سے وہ دلفگار کر کے مجھے
اُڑا چکا ہوں بہت خاک ہو نگاہِ کرم بلند بھی تو کرو بے وقار کر کے مجھے
غضب ہی بھولا پن ادا میں کائنات تھا کیا وہ پھولے پھرتے ہیں اپنا شکار کر کے مجھے
اگرچہ ملنے کو آتے ہیں پر ذرا کی ذرا مزے وہ لیتے ہیں پر اضطرار کر کے مجھے
متاعِ صدقۂ خوبانِ ناز پرور ہوں بڑھایئے مرا رتبہ نثار کر کے مجھے
دماغِ اہلِ جہاں میں مہک ہو میری نذیر
پھرا دے نافۂ مشک تتار کر کے مجھے

(نذیر حسین احمد انبالوی)